اردو ادب میں
جوتے
پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

اردو ادب میں جوتے

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

URDU ADAB MEIN JOOTE

by

Prof. Manazir Ashiq Harganvi

Kohsaar, Bhikanpur- 3, Bhagalpur - 812001 (Bihar)
Mob : 09430966156

Year of Edition 2019
ISBN 978-93-88736-35-0

₹ 100/-

نام کتاب	:	اردو ادب میں جوتے
مصنف	:	پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی
سن اشاعت	:	۲۰۱۹ء
قیمت	:	۱۰۰ روپے
مطبع	:	روشان پرنٹرس، دہلی۔۶

ملنے کے پتے

☆امرین بک ایجنسی، احمد آباد۔M.08401010786
☆حسامی بک ڈپو، حیدرآباد۔Ph.040-66806285
☆ہدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، حیدرآباد۔Ph.040-24411637
☆مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، ممبئی۔Ph.022-23774857
☆بک امپوریم، پٹنہ۔M.09304888739
☆دانش محل، لکھنؤ۔Ph.0522-2626724
☆مرزا ورلڈ بک ہاؤس، اورنگ آباد۔M.09325203227
☆کشمیر بک ڈپو، سری نگر۔M.09419761773
☆گلوبل بکس، سری نگر۔M.09070340905
☆قاسمی کتب خانہ، جموں۔M.09797352280
☆ہمالیہ بک ورلڈ، حیدرآباد۔Ph.040-66822350
☆انجمن ترقی اُردو، حیدرآباد۔M.09247841254
☆دکن ٹریڈرس، حیدرآباد۔Ph.040-24521777
☆کتاب دار، بک سیلر، پبلشر، ممبئی۔Ph.09869321477
☆عثمانیہ بک ڈپو، کلکتہ۔M.09433050634
☆راعی بک ڈپو، الہ آباد۔M.09889742811
☆ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔
☆مکتبہ علم و ادب، سری نگر۔M.094419407522
☆وطن پبلیکیشنز، سری نگر۔M.09419003490
☆نعیم بک سیلرز، مئوناتھ بھنجن۔M.09450755820

پاکستان میں ملنے کا پتہ : ملک بک ڈپو، چوک اردو بازار، لاہور (پاکستان) Ph. 0092-42-37247480, 37231388

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, 45678286, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com
website: www.ephbooks.com

گفتنی

جوتے کی اہمیت سے انکارنہیں کیاجاسکتا۔اسی لئے اردو کے ادیبوں اور شاعروں نے اپنی بوقلمونی سے اسے بھی اظہار خیال میں جگہ دی ہے۔

لیکن نقادوں نے اسے اعتبارنہیں بخشا ہے اور محققوں نے اس پر توجہ نہیں دی ہے۔

میں نے پہلی کوشش کی ہے کہ جوتے کی انوکھی لذت کوابدیت سے ہم کنار کیا جائے اور معنی کے عقب میں موجود جوہر کا اقرار کیا جائے۔

جوتے کی Poetics باہر کے کسی جوہر یا اصل الاصول کے تابع نہیں ہوتی بلکہ یہ اپنے ہونے سے مرتب ہوتی ہے۔جس میں توانائی ہے،استحکام ہے اور یہ شخصیت شناسی میں مددگار ہے۔

جوتے میں وسعت کے امکانات بہت ہوتے ہیں۔اس کا تعلق معاشرے اور اقدار سے زیادہ قریب ہے۔تکنیکی ضرورتوں کوبھی نظرانداز نہیں کیاجاسکتا۔

ضرورت ہے کہ جوتے سے ترسیل علم کیا جائے۔اس کے سیاق وسباق پر موجود مواد سے معنی در معنی کی لامختتم پرتوں سے استفادہ کیا جائے اور اس کے وجدان اور بصیرت سے عکس در عکس کی چمک کی نمو سے روشنی حاصل کی جائے تا کہ جوتے کی تخلیقی فکر کی انگیخت سامنے آسکے۔

جوتے سے انسان کا رشتہ ازلی اور ابدی ہے۔اس میں خلوص،محبت اور فطرت کودخل ہے۔اس کے خصائص جدت کے عنصر کا لبادہ اوڑھے رہتے ہیں جو حرکت کا جواز بنتے ہیں۔اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں حرکت کی اندرونی طبیعات جہان وجود رکھتی ہے۔

جوتے کی ادبی نوعیت اوراس کے اثرات کے حوالے اس کتاب میں موجود ہیں۔پذیرائی ملے گی اس کا یقین ہے۔

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی
Kohsar, Bhikanpur-3, Bhagalpur-812001

۱۴ردسمبر ۲۰۰۸ء کا دن اکیسویں صدی کا یادگار، تاریخ ساز اور سبق آموز اس لئے ہے کہ بغداد میں ایک پریس کانفرنس کے دوران جواں سال اور دلیر ٹی وی جرنلسٹ المنتظر زیدی نے دنیا کے سوپر پاور اور امریکہ کے سوپر مین پریسیڈنٹ جارج بش کو جوتے پھینک مارے اور مسلمانوں کے ساتھ مظلوم انسانوں کے جذبات کی صحیح ترجمانی کردی۔

جوتا ہندی لفظ ہے۔ اسم مذکر ہے۔ اس کے معنی پاپوش، کفش، زیر پائی ہے۔

ویسے جوتا کے معنی نقصان، گھاٹا، بڑا بھاری، احسان، سلوک بھی ہے۔

جوتا سے متعلق کئی محاورے مشہور ہیں۔ مثلاً :

جوتا اٹھانا = جوتا مارنے کو تیار ہونا۔ جوتا لے کر مقابلہ کرنا۔ گستاخی کرنا، تابعداری کرنا۔

جوتا اچھلنا = جوتی پیزار ہونا، بدتہذیبی کی لڑائی ہونا۔

جوتا چلنا = جوتوں سے لڑنا۔ بدتہذیبی کا ظاہر ہونا۔

جوتا برسنا = جوتے لگنا۔ خوب جوتیاں پڑنا۔ جوتیوں سے سلامی اترنا۔

جوتا چھپانا = ایک رسم ہے۔ سالیاں نوشاہ کا جوتا رخصت کے وقت چھپاتی ہیں۔

جوتا دینا = پہننے کے لئے جوتی کا جوڑا دینا۔ جوتا مارنا۔ بے عزتی کرنا۔

جوتا سر پر ٹوٹنا = شدت سے پٹنا۔

جوتا لگنا = نقصان ہونا۔ خسارہ ہونا۔ شرمندگی ہونا۔ خجالت ہونا۔

جوتا مارنا = ملامت کرنا۔ طعنے دینا۔ برا بھلا کہنا۔ احسان کر کے شرمندہ کرنا۔

جوتے سے خبر لینا = جوتا مارنا۔

جوتے کا یار = زبردست کا دوست

جوتے کاری = مار پیٹ۔ جوتیوں سے خبر لینا۔

جوتی اچھالنا = جوتی چلنا۔ رسوائی ہونا۔

جوتی پر جوتی چڑھنا = سفر کا شگون نکلنا۔ سفر کی فال نکلنا۔

جوتی پر رکھ کر روٹی دینا = حقارت کا برتاؤ۔ نہایت ذلت سے نان ونفقہ دینا۔

جوتی پر کاجل پارنا = جاہل عورتوں کا ٹوٹکا۔ شوہر کو مطیع کرنے کے لئے ایک طریقہ۔

جوتی پر مارنا = ناچیز سمجھنا۔ ذلیل اور حقیر سمجھنا۔ نفرت ظاہر کرنا۔

جوتی پہننا = پاؤں میں جوتی ڈالنا۔ بازار سے جوتی خریدنا۔

جوتی پہنانا = جوتی خرید کر دینا۔ دوسرے شخص کے پاؤں میں جوتی ڈالنا۔

جوتی پیزار = مار پیٹ۔ لڑائی دنگا۔ جھگڑا کرنا۔

جوتی پیزار چلنا = مار کٹائی ہونا۔ بحث مباحثہ ہونا۔ تھکا فضیحتی ہونا۔

جوتی پیزار لڑنا = جھگڑا فساد کرنا۔ آپس میں لڑنا۔

جوتی چلنا = لڑائی جھگڑا ہونا۔

جوتی چھپائی = وہ نیگ جو دولہا کی سالیاں اس کی جوتی وداع کے وقت چھپا کر لیتی ہیں۔

جوتی خور = نیچ۔ پاجی۔ بے غیرت۔ وہ شخص جسے پٹنے کی عادت ہو۔

جوتی کی نوک سے = بلا سے۔ کچھ پروا نہیں۔

جوتی کو کیا غرض = بیزاری ظاہر کرنے کی جگہ۔

جوتی کے برابر نہ سمجھنا = حقیر سمجھنا۔ خاطر میں نہ لانا۔ ہیچ اور ناچیز سمجھنا۔ کچھ نہ سمجھنا۔

جوتی کے تلے سے ناک کاٹ لینا = خوب ذلیل کرنا۔

جوتیاں اٹھانا = کسی بڑے آدمی کی خدمت کرنا۔ زیر تربیت رہنا۔ نوکری بجانا۔

جوتیاں بغل میں دبانا = دبک کر نکل جانا۔جوتیوں کو بغل میں چھپانا۔

جوتیاں چٹخاتے پھرنا = خاک چھانتے پھرنا۔واہی تباہی پھرنا۔مارے مارے پھرنا۔نکما پھرنا۔

جوتیاں سر پر رکھنا = خوشامد کرنا۔ٹہل جانا۔

جوتیاں سیدھی کرنا = عزت کرنا۔تعظیم بجالانا۔خدمت کرنا۔

جوتیاں کھانا = جوتیوں سے پٹنا۔طعنے سہنا، برا بھلا سننا۔خفت اٹھانا۔

جوتیاں گانٹھنا = جوتیوں کی مرمت کرنا۔ذلیل کام کرنا۔موٹی سلائی کرنا۔
جوتیوں میں پیوند لگانا۔

جوتیاں مارنا = ذلیل ورسوا کرنا۔طعنہ دینا۔برا بھلا کہنا۔

جوتیوں سمیت آنکھوں میں بیٹھنا = زبردستی جھٹلانا۔آنکھوں میں خاک ڈالنا۔

جوتیوں کا صدقہ = جوتیوں کے طفیل میں۔آپ کی بدولت۔

جوتیوں میں دال بٹنا = آپس میں پھوٹ پڑنا۔لڑائی جھگڑا ہونا۔دانتا کلکل ہونا۔

جوتا اور جوتی پر اردو شاعروں نے قبل بھی خامہ فرسائی کی ہے۔میر تقی میر کا یہ شعر بہت مشہور ہے۔

اے میر غیر تجھ کو گر جوتیاں نہ مارے
سید نہ ہووے پھر تو کوئی چمار ہووے

امام بخش ناسخ نے بھی جوتی کے ایک محاورہ کو یوں شعر بند کیا ہے۔

پھبتی یہ نئی ہے ماہِ نو پر
گویا تری جوتی کی انی ہے

ناسخ کا ہی یہ شعر دیکھیے۔

آسماں سے نظر آتے نہیں تارے دن کو
تیری جوتی کے چمکتے ہیں ستارے دن کو

قلق کی مثنوی سے یہ دو شعر ملاحظہ کیجیے۔

پھر یہ کیوں ناک گھستے آتے ہو

جوتیاں کس لئے اٹھاتے ہو

جوتی جانے مری مجھے کیا کام

جس نے بلوایا ہے اسے دو پیام

جوتیاں چٹخانے والوں پر صفدر آہ نے یوں طعنہ زنی کی ہے۔

آپ کے کوچے میں دشمن رات دن

جوتیاں پھرتے ہیں چٹخاتے ہوئے

نظیر اکبر آبادی جیسے عوامی شاعر نے اپنی مشہور نظم ''آدمی نامہ'' میں جوتے کو موضوع بنایا ہے۔

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں

بنتے ہیں آدمی ہی امام او رخطبہ خواں

پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآں اور نمازیاں

اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں

جو ان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اور اکبر الہٰ آبادی کا شعر زبان زدعوام ہے۔

بوٹ ڈاسن نے بنایا میں نے اک مضمون لکھا

میرا مضموں رہ گیا ڈاسن کا جوتا چل گیا

لیکن یہ سب جوتے قبل کے شاعروں کے ہیں۔ اکیسویں صدی کی پہلی دہائی ختم ہونے سے پہلے منتظر الزیدی کا جوتا اتنا مشہور ہوا کہ اردو شاعروں نے اسے بھی موضوع بنایا ہے اور ۲۰۰۸ء کے آخری مہینہ کو تاریخ ساز قرار دیا ہے۔ بقول رؤف عامر، زیدی اربوں انسانیت نواز مسلمانوں وانسانوں کا ہیرو بن چکا ہے۔ دسمبر کا مہینہ عراق کی خون آلود تاریخ میں ویسے ہی خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ دسمبر تھا جب جنگ عظیم کے بعد برطانیہ نے عراق کو تاراج کیا اور وہ بھی اس مہینے کا ایک المناک وشرمناک دن تھا جب امریکی فوجیوں نے صدام حسین کو نور المالکی ایسے ضمیر فروش اور بندریا کی طرح وائٹ

ہاؤس کے اشارے پرناچنے والے میر صادقوں ومیر جعفروں کی معاونت سے گرفتار کیا گیا تھا۔

اور پھر وہی دسمبر آیا جب منتظر زیدی نے بش پر جوتے برسا کر عراقی قوم ومسلمانوں کے جذبات کا روز روشن مظاہرہ کیا۔ دنیا کے واحد سپر پاور کا دادا گیر صدر چھپ چھپا کر الوداعی دورے پر بغداد پہنچا تھا۔ ایک طرف وہ اپنے خوشہ چینوں کے ساتھ جھوم جھوم کر ظلمت کی داستانوں کو کارناموں کا روپ دیکر اترا رہا تھا تو دوسری جانب وہ ہاتھ ہلا ہلا کر اپنی فوجی قوت وسپر پاوری کے نغمے گا رہا تھا۔ اسی اثنا میں المنتظر زیدی نے دو جوتے برسا کر بش کی خدمت کا صحیح تحفہ دیا۔ گوکہ زیدی کا نشانہ خطا ہو گیا مگر اس کا جوتا وہ کام کر گیا جو نائن الیون کے بعد پوری ائمہ کے حاکم نہ کر سکے۔ نو کے بعد دس آتا ہے یا گیارہ سے پہلے دس آتا ہے۔ زیدی کے جوتے کا سائز دس تھا۔

تیرہ دسمبر کو جوتوں کا عالمی دن منایا جانا چاہئے کیونکہ اسی روز سپر پاور کا غرور دو جوتوں کے سامنے ڈھیر ہو گیا تھا۔

وہ اتوار کا دن تھا جب المنتظر زیدی نے بش کے پریس کانفرنس میں بہ آواز بلند عربی میں کہا ''لو کتے! عراقی عوام کی طرف سے الوداعی تحفہ۔'' اور اس نے اپنے پاؤں سے جوتا نکال کر بش کو نشانہ بنایا۔ نشانہ خطا ہوا تو اس صحافی نے اپنا دوسرا جوتا اتار کر کھینچ مارا۔ اس بار عراقی وزیر اعظم نوری المالکی نے اپنے بازو سے یہ وار روکا۔

المنتظر زیدی جیسے شیر کی دلیری پر اردو شاعروں نے فنکارانہ انداز میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔

ملی کردار کو جس کے بلندی آسمانوں کی
دکھایا جس نے بے باکی کا جوہر برسرِ محفل
جہاں میں ہر طرف پھیلا ہے شہرہ جس کی جرأت کا
ہے جس کے منہ کی گالی بھی بہت تعریف کے قابل
تمنا قید کی سختی سے پختہ تر ہوئی جس کی
کہ ہے تاریخ کا حصہ بھی جوتا جس کا دس نمبر
جو پھر اپنے عمل کو چاہتا اک بار دہرانا

کہ جوتا اس بہادر کا لگے ظالم کے سر ہی پر

بہادر ہے وہ عراقی صحافی منتظر زیدی

مناظر عاشق ہرگانوی

ترجیحی سطح پر یہ پہچان کی نئی کروٹ ہے :

کام اس طرح آگیا جوتا　　بش کو جنت دکھا گیا جوتا

لوگ ڈرتے تھے خوف کھاتے تھے　　سب میں ہمت جگا گیا جوتا

پاؤں کی دھول سر پہ برسا کر　　اپنی عظمت دکھا گیا جوتا

کتنے پردے پڑے تھے چہرے پر　　سارے پردے اٹھا گیا جوتا

وار گولی سے بم سے بڑھ کر ہے　　کتنی باتیں بتا گیا جوتا

سارے عالم میں واہ واہ ہوئی　　مت سمجھنا ، گیا گیا جوتا

ہر کمینے کو مار جوتے سے　　یہ سبق ہے سکھا گیا جوتا

کام کا تھا بہت ہی دس نمبر　　ساری دنیا پہ چھا گیا جوتا

بولیاں لگ رہی ہیں لاکھوں کی　　اپنی قیمت بتا گیا جوتا

ساری محفل کی آنکھیں چندھیائیں　　ایسا جلوہ دکھا گیا جوتا

سب کے سب ایک پل میں ششدر تھے　　ڈائیس سارا ہلا گیا جوتا

گھن گرج کے بغیر برسا ہے　　سب اکڑفوں بہا گیا جوتا

اس کی آنکھوں سے خون بہتا ہے　　اس قدر ہے رُلا گیا جوتا

سب کا کہنا ہے یہ حفیظ انجم　　دن میں تارے دکھا گیا جوتا

حفیظ انجم کریم نگری

قوم اور معاشرہ کو محکوم بنانے پر یہ ضرب کاری ہے :

کیا نیا گل کھلا گیا جوتا　　خوں کے آنسو رلا گیا جوتا

ساری دنیا کے انگنت جوتے　　ساتھ اپنے چلا گیا جوتا

لاکھوں انسان کھانے والے کو　　آخرش آج کھا گیا جوتا

اس نے کیسے چمن اجاڑا تھا　　یاد اس کو دلا گیا جوتا

تو نے دنیا کے خواب چھینے تھے　　لے ترے سر پہ آ گیا جوتا

اپنی جنت بھی دیکھ لے شداد　　دیکھ نقشہ بنا گیا جوتا

سر یقیناً جھکا تکبر کا　　اپنی طاقت دکھا گیا جوتا

منتظر جس کا تھا رضا، زیدی　　وہی منظر دکھا گیا جوتا

رضا جالنوی

اسلامی نظام عدل کو تہس نہس کرنے کی سازش کے خلاف احتجاج ہے:

خدا جانے کیا ایجاد کس نے پاؤں کا جوتا

کہ ہر انسان کے پیروں کی زیبائش ہوا جوتا

کہیں بھی جائیں یہ ہر دم ہمارے ساتھ رہتا ہے

بچاتا کیڑے کانٹوں سے ہے یہ مشکل کشا جوتا

بہت سی مجلسوں میں اس کا استعمال ہوتا ہے

مواقع ایسے بھی آئے کہ سنسد میں چلا جوتا

ہزاروں مسئلے ایسے جو یوں تو حل نہیں ہوتے

مگر کرتا ہے ایسے مسئلوں کا فیصلہ جوتا

ہوا کرتی تھی جسکی لاٹھی اسکی بھینس ہوتی تھی

اب اسکی بھینس مانی جائیگی جس کا چلا جوتا

یہ سچ ہے منتظر زیدی نے بش پر جوتا پھینکا تھا

ضیافت کے لئے وہ لے کے آیا تھا نیا جوتا

خطا پہلا نشانہ ہو گیا پھر بھی نہ باز آیا

اچھالا اس مجاہد نے ہوا میں دوسرا جوتا

اگر چہ دوسرے حملے سے بھی وہ بچ گیا لیکن

ریاست ہائے امریکہ کا جھنڈا چھو گیا جوتا

طمنچہ، توپ اور بندوق دہشت ناک ہیں بیحد

مگران سارے ہتھیاروں میں ہے سب سے بڑا جوتا

ہمیشہ ظلم کے آگے بغاوت کا سبق دیگا

نئی تاریخ کا اک بابِ زریں بن گیا جوتا

ظفرنسیمی

زندگی کے اس جرأت مندانہ سوزِ دروں میں تصویر کائنات کا نیا رنگ ہے :

منتظر تو نے بھی کیا خوب لگائے جوتے | ساری دنیا میں عجب دھوم مچائی تو نے

شان ہر ملک میں اپنی وہ جتاتا تھا بہت | ساری شان اس کی تو مٹی میں ملائی تو نے

....

اس کو بغداد میں ذلت کا ملا ہے تحفہ | خواب میں آ کے اسے جوتے دکھائے تو نے

لوگ ہر سال تو شیطان پہ کنکر پھینکیں | یہ عبادت کے نئے طور سکھائے تو نے

....

عمر بھر منھ کو دکھانے کے وہ قابل نہ رہا | ایسا حال اس کا مرے دوست بنایا تو نے

ڈھونگ ہر وقت ڈرانے کا کیا کرتا تھا | مرحبا مرحبا کیا خوب ڈرایا تو نے

....

ہوں گے بغدادی اور افغانی شہداد شاداں | ان کی روحوں کو یہ آرام دلایا تو نے

مستحق ایسی سزا ہی کا وہ ملعون ہوا | اس کو واللہ ایک آئینہ دکھایا تو نے

....

نورالدین امیر

اس ترجمانی میں گل کی شبنم کی بجائے شعلے کا شرار ہے :

دھمک سے جوتوں کے ہل جائے کیسا تخت ہے وہ

لگی ہے ضرب جو اس پر بہت ہی سخت ہے وہ

خدا کرے کہ یہ ذلت نہ ہو کسی کو نصیب

بوصفِ جاہ و حشم خود سیاہ بخت ہے وہ

لئے تھے جس نے بہت لطف حکمرانی کے

بڑا ہے اس پہ جو آخر برا ہی وقت ہے وہ

فرازِ جاہ نے مغرور کر دیا ہے اسے

بلندیوں پہ پہنچ کر بہت ہی پست ہے وہ

نظر جو آیا ہے پاپوش دست مسلم میں

بہ شکلِ نعلِ نجس عصرِ کرخت ہے وہ

اٹھا تھا ہاتھ جو سرکوبیٔ ستم کے لئے

شکار پنجۂ عفریت چہرہ دست ہے وہ

ڈسے گی اس کو سدا ضرب منتظر حامد

اخیر عہد صدارت میں گرچہ مست ہے وہ

حامد سراجی

المنتظر زیدی کی نفرت کے اظہار کو اردو شاعروں نے حقیقت طرازی کے نئے زاویے سے دیکھا ہے۔ ان میں بہت گہرا Pathos ہے۔ درد کی آنچ ہے اور انسانی قدروں کے المیے کی سلوٹیں ہیں۔

المنتظر زیدی پہلی بار ۲۰۰۷ء میں چرچا میں آیا تھا جب القاعدہ کے لوگوں نے اسے اغوا کر لیا تھا۔ وہ ۲۰۰۵ء سے ''البغدادیہ ٹی وی چینل'' میں کام کر رہا ہے۔ الجزیرہ چینل اور العربیہ نیٹ پر ایک ریٹائرڈ عراقی ٹیچر مخافہ نے اعلان کیا کہ المنتظر زیدی کے جوتے کو وہ دس ملین ڈالر میں خریدنا چاہتا ہے۔ اس جوتے کی وجہ سے اردو ادب مالا مال ہوا ہے۔

اردو کے دیگر معتبر شاعروں نے بھی ضیا پاشیاں کی ہیں۔ اس طرح جہاں ذہنی سلطنتیں قائم ہوتی ہیں وہیں فرخندہ لہریں جلوہ سامانیوں کو، نقش ہائے رنگا رنگ کو اعتبار بخشتی ہیں۔ انبساط وابتہاج کی مثال دیکھیے :

اس نئی تجویز پر اک شور تھا ایوان میں
اور بھی تو ٹیکس جاں لیوا تھے ہندوستان میں

اور بھی چیزیں تھیں جن پر ٹیکس کی بھر مار ہے
اس رعایت کا مگر جوتا ہی کیوں حق دار ہے

رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا تھا ہر اک ممبر کا جوش
تڑ سے اک جوتے نے آ کر کر دیا سب کو خموش

بولا جوتا مجھ کو یہ تکرار بھاتی ہی نہیں
یہ بھی بتلا دوں خوشامد مجھ کو آتی ہی نہیں

یہ بھی واضح ہو کہ ہوں روزِ ازل سے بد مزاج
ٹیکس اور مجھ پر، لیا ہے میں نے دنیا سے خراج

تم نے دیکھی ہی نہیں شاید مری شانِ عظیم
مدح خواں ہے میرا ہر دورِ رواں دورِ قدیم

دخل رکھتا ہوں نہ رکھتا تھا کبھی اخلاق میں
پھر بھی میرا ذکر ہے تاریخ کے اوراق میں

میں کہ ہوں قہرِ الٰہی میں کہ عالی جاہ بھی
میں ہی چنگیز و ہلاکو میں ہی نادر شاہ بھی

وادیٔ گجرات ہو یا ہو چمن زارِ دکن
ہر جگہ رکھی ہے میں نے گرم اپنی انجمن

مدتیں گزریں مگر رنگِ طبیعت ہے وہی
آج بھی دنیا میں میری شان و شوکت ہے وہی

آج پاکستان قائل ہے مری تاثیر کا
وہ بھی مجھ سے پوچھتا رہتا ہے حل کشمیر کا

لکھنے والے اسکو لکھیں گے نئے اتہاس میں
مسئلہ بھاشا کا میں نے طے کیا مدراس میں

میں نہیں ساتھی تو کوئی بھی نہیں لیتا خبر
پا برہنہ جس سے اردو پھر رہی ہے در بدر

ہر قدم پر چھوڑتا جاتا ہوں میں اپنی یادگار
خطۂ پنجاب و ہریانہ ہے جس کا شاہکار

یہ تو قسمت ہے کہ سستے دام آ جاتا ہوں میں
ورنہ ہر اسمبلی میں کام آ جاتا ہوں میں

اچھے اچھوں کی بنا رکھی ہے میں نے دُردَشا
میں ہوں طاقت نام ہیں میرے ہی برہمن ورشا

کون ہے جو جا کے واشنگٹن میں جھک جاتا نہیں
ایک وہ ہوں میں جو یوان او سے گھبراتا نہیں

مرحلہ کوئی بھی ہو میں موجبِ تکمیل ہوں
نیگرو ہوں میں ہی میزو میں ہی اسرائیل ہوں

جس طرف دیکھو گے پاؤ گے مرا ہی انتظام
ہو وہ کوئی الجزائر یا ہو کوئی ویت نام

مجھ کو حیرت ہے کہ کیسے نام نیچے تھا مرا
لیڈروں سے تو الیکشن کا پیچھے تھا مرا

ٹیکس مجھ پر لگ گیا ہوگا کسی کی بھول سے
یا کوئی نا آشنا ہوگا پرانے رول سے

کون ہے ورنہ نہیں واقف جو میرے نام سے
میری عادت میری خصلت اور میرے کام سے

جس کو تم سمجھے رعایت وہ مرا ادھیکار ہے — سچ اگر پوچھو تو یہ دنیا ہی اپنی یار ہے
اہلِ دانش جانتے تھے قدر و قیمت کو مری — قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

............ہلال سیوہاروی

یہ ایک طرح سے آفاقی پیغام ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا :

کس فکر کی کس ذہن کی ایجاد ہے جوتا — حیرت ہے کہ کیا نقش خدا داد ہے جوتا
مچ مچ کی صدا بولے کہ یہ راہنما ہے — احساسِ خوشی بڑھتا ہے جب جوتا نیا ہے
کہنے کو تو یہ پاؤں کی زینت کے لئے ہے — سچ یہ ہے کہ یہ سب سے محبت کے لئے ہے
چھیڑے کوئی لڑکی کو بگڑ جاتا ہے جوتا — عاشق کی پٹائی کو اکھڑ جاتا ہے جوتا
پاؤں میں رہے جب تو مزے جھول کے لوٹے — استاد بگڑ جائیں تو شاگرد پہ ٹوٹے
ہو گندہ ذہن کوئی تو خاطر کو یہ آئے — چپ کر کے اُسے اپنی جگہ لوٹ کے جائے
جھگڑا ہو زن و شو میں تو ہو اسکی ضرورت — ٹھنڈا کرے تیور کو یہ تیور کی بدولت
گنتی کبھی الٹی بھی گنا دیتا ہے جوتا — شاگرد معلم کو لگا دیتا ہے جوتا
جوتے کی ہے کیا شانِ سیاست مرے بھائی — دیکھو کہ ہے کیا اس کی کرامت مرے بھائی
ہر جا پہ ہے عزت اسے رسوائی نہیں ہے — سوچو کہ کہاں اس کی پزیرائی نہیں ہے
بگڑے ہے جہاں بات اچھل جاتا ہے جوتا — اب مجلسِ قانون میں چل جاتا ہے جوتا
جوتے کی چٹکار کا یہ حال رہے گا — جانو کہ کوئی سر بھی سلامت نہ بچے گا
اللہ ہمیں، آپ کو، جوتے سے بچائے — یہ زندہ دلی اپنی نہ ہم سب کو دکھائے

............متین عمادی

اس ترغیب میں فلسفہ کی نشانیاں ہیں اور امکان کے موڑ ہیں :

آفریں اے منتظر زیدی عراقی آفریں — تیرے جوتے کا جہاں بھر میں کوئی ثانی نہیں
صاحب ملک و حکومت ہو کہ افسر یا وزیر — تیرے جوتے کی نہیں ملتی کہیں کوئی نظیر
کر گیا ہے تیرا جوتا وہ کرشماتی کمال — ان دنوں ممکن نہیں ملنی کوئی جس کی مثال

بش بالفاظ دگر نا قابل تسخیر بش — جس کی شیطاں کی طرح گھر گھر میں ہے تشہیر بش

اس کو گر اس دور کا چنگیز کہیے تو بجا — ایک عفریت ہلاکت خیز کہیے تو بجا

جبر گر دیکھے ہلاکو اس کے تو شرمندہ ہو — ظلم دیکھے کوئی ڈاکو اس کے تو شرمندہ ہو

شغلِ خونریزی کے آگے جس کے ہٹلر ہیچ ہے — سامنے جس کے ستم کے ہر ستمگر ہیچ ہے

رکھ دیئے برباد کر کے جس نے افغان و عراق — ظلم کا شاہد ہے جس کے اک جہاں بالاتفاق

جو شکنجہ کس رہا ہے ان دنوں ایران پر — نظر بد ہے جس کی ہندوستان و پاکستان پر

تاجِ فرماں ہیں جس کے مصر اور شام و عرب — انگلیوں پر آج جس کی ناچتے ہیں سب کے سب

روندتا ہے سب کی آزادی کو جو پیروں تلے — رکھتا ہے ہر ایک آبادی کو جو پیروں تلے

بھول بیٹھا ہے خدائے بالا و برتر کو جو — نوک پر جوتے کی رکھتا ہے زمانے بھر کو جو

پڑ رہے ہیں اس کے سر پر جوتے قدرت دیکھئے — اک معزز کی سرِ محفل یہ ذلت دیکھئے

بد دعائیں یہ یتیموں اور بیواؤں کی ہیں — بد دعائیں یہ شہیدوں کی دکھی ماؤں کی ہیں

بش کے ذلت کے سفر میں ہے یہ پہلا ہی قدم — جھیلنی ہیں ذلتیں اس کو تو ایسی دم بدم

مار کر جوتے سرِ محفل کیا اس کو ذلیل — اک عراقی نے ادا کی سنتِ ربِّ جلیل

مار کر جوتا جو بش کو قوم کا ہیرو ہوا — جو تھا دنیا بھر کا ہیرو آج بش زیرو ہوا

مرحبا اے منتظر زیدی عراقی مرحبا — عالمِ اسلام کا سر تو نے اونچا کر دیا

ہر بلا سے دور رکھے تجھ کو ربِّ کردگار

ہوں جیالے تجھ سے ہر جا بے حساب و بے شمار

ڈاکٹر محبوب راہی

یہاں نصیحت اور فضیحت کی پوری عکاسی ہے۔ جس میں اقتدار کی آبلہ پائی ہے:

جنابِ بش کی جانب یوں ہوئی پرواز جوتے کی

کہ پھیلی ہے جہاں میں چار سُو آواز جوتے کی

اُدھر بش کا جھکائی دے کے اس ہتھیار سے بچنا
ادھر نفرت زمانے بھر کی ، ہم آواز جوتے کی

بچارا حیرتی ہے کیوں نہ ''بوتھے'' پر لگا جا کر
ابھی تک دیدنی ہے حسرتِ پرواز جوتے کی

میزائل اور بم جوتوں پہ بھی اب داغے جائیں گے
خطا ہرگز نہ ہوگی یہ نظر انداز جوتے کی

بڑا ہی مطمئن لگتا تھا جوتوں کے 'سواگت' سے
پڑی ہو اُس پہ گویا کہ ''نگاہ ناز'' جوتے کی

یہ حسرت ہی رہی، ٹکراتا جا کر اس کے ماتھے سے
سماعت میں اترتی کاش یہ آواز جوتے کی !

نسیم اک روز برسے گا یہ جا کر قصرِ ابیض پر
''سپر سانک'' ہوئی رفتار جب ناراض جوتے کی

نسیم سحر

فاصلے سے بھرے استدلال میں خیالستان کے عناصر ہیں :

وہ بڑا بیمار تھا ، آرام جوتے نے دیا
دردِ سر میں مبتلا تھا، ''بام'' جوتے نے دیا

زد سے بچنے کے لئے جھکتا رہے، جھکتا رہے
صدر امریکہ کو اچھا کام جوتے نے دیا!

بش کو اب دنیا میں جوتا خور کہتے ہیں سبھی
کس قدر اچھا اسے یہ نام جوتے نے دیا

کاش وہ بش کی سمجھدانی میں داخل ہو سکے
بیکراں نفرت کا جو پیغام جوتے نے دیا

جو زمانے بھر کے لیڈر اس سے کہہ سکتے نہ تھے

وہ کھرا پیغام اسے اک عام جوتے نے دیا

لب زباں بندی کی مشکل سے نکل آئیں گے سب

سارے مظلوموں کو اذنِ عام جوتے نے دیا

تمغۂ جرأت اسے دینے کو جی چاہے نسیم

کارنامہ خوب سر انجام جوتے نے دیا!

نسیم سحر

یہ ایک طرح سے تعلق کی ترجمانی ہے جو شعلہ بار ہے :

موچی! مرے ہاتھوں میں ایسا کوئی جوتا دے ہو ناپ کا نمبر دس، پر وزن کا ہلکا دے

چمڑا جو تلے میں ہو، وہ تیل میں بھیگا ہو اور چونچ پہ جوتے کی چکنائی کا رگڑا دے

ہو اُس میں صفت ایسی دشمن کو وہ پہچانے راکٹ کی طرح جا کر، وہ منہ پہ طمانچہ دے

ظالم کی طرف پھینکوں جب اس کو گھما کر میں رائیس کو بھی لرزا دے، چینی کو بھی دہلا دے

پاپوش کی بابت یہ ایسی ہے غزل شوکتؔ

جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے

شوکت جمال

جمالیاتی تسکین کی مثال ایسی ہی ہوتی ہے۔ اس میں خود اعتمادی دیکھی جا سکتی ہے :

بش کو جوتے ہوں مبارک، زیدی کو خوش بختیاں

آ رہی ہے تہنیت کی یہ صدا کونین سے

متقی نے کہہ دی ہے تاریخ اچھی لا کلام

لی خبر زیدی نے بش کی دفعتہً نعلین سے

۲۰۰۸ء سید عباس متقی

یہ داخلی کیفیت اور تاثرات کی غمازی ہے :

چلا کر بش پہ جوتے کر دیا ثابت یہ زیدی نے
کہ ایسے شخص کو دنیا عرب کا شیر کہتی ہے
تقاضہ ہے یہ غیرت کا سر بزم جہاں آخر
جو زندہ قوم ہے ہرگز نہیں خاموش رہتی ہے

●●●

عجب یہ کھیل نکلا بش کو جوتے مارنے والا
کہ انٹرنیٹ پر جس کو مزے سے کھیلتے ہیں سب
کسی کی ایسی رسوائی نہیں دیکھی زمانے میں
ہوا ہے حشر وہ شیطان کا جو دیکھتے ہیں اب

ابراہیم اشک

اس نقش میں سیل زمانہ ہے اور فکری درماندگی بھی ہے :

دنیا کو دیکھنا ہے کہ کیا بات تھی جس نے
سہمے ہوئے مظلوم کو غصے سے بھر دیا
جو کام کبھی ایٹمی قوت نہ کر سکی
وہ کام فقط پاؤں کے جوتے نے کر دیا

رئیس احمد نظامی

بین الاقوامی سطح پر احتجاج کا یہ بگل ہے جس میں ماحول اور نظریات کی عکاسی ہے :

یہ سرخ چہرہ ، یہ لال آنکھیں
یہ تنگ ماتھے پہ سینکڑوں بل
یہ کپکپاتے سے ہونٹ تیرے
سراپا غیظ وغضب کے پیکر!
یہ تمکنت یہ وقار تیرا

نہ کام تیرے ذرا بھی آیا
تمام اقدام ، ساری کوشش
تری حفاظت کے واسطے تھی
سراپا ششدر، سراپا حیراں
بت ندامت بنی ہوئی تھی
نہ کوئی لشکر کشی ہوئی
نہ بم گرا اور نہ کوئی راکٹ
بس ایک جوتا
جو بم سے بڑھ کر اثر کا حامل
جو گولیوں سے بھی زیادہ کامل
جو راکٹوں سے بھی بڑھ کے قاتل
ترے رخ کم تریں کی جانب
بڑی ہی تیزی ، بڑی ہی سرعت کے ساتھ لپکا
بتانے اوقات کیا ہے تیری
یہ جوتا ! جوتا نہیں ہے پیارے
یہ اک حقارت کی ہے علامت
جو سج رہا ہے نہ صرف تجھ پر
یہ سج رہا ہے تمام یورپ ، تمام امریکی
بربریت کے بدنما اور کریہہ رُخ پر
یہ جوتا ! جوتا نہیں ہے پیارے
یہ احتجاج اور نفرتوں کا
بلیغ اعلامیہ ہے پیارے

عظیم اظہار یہ ہے پیارے
یہ مصحفِ سامراج بادی پہ سج رہا ہے
جو تیرے منھ پر بھی سج رہا ہے
جو تیرے یورپ کے ہمدموں اور حواریوں پر بھی سج رہا ہے
یہ جوتا! جوتا نہیں ہے پیارے
یہ آدمیت، یہ حق و انصاف کی طرف سے
عظیم اقدار کی طرف سے
بہت ہی واضح جواب ہے یہ
ترے عمل کا حساب ہے یہ
نئے عزائم کا باب ہے یہ
انوکھا حُسن خطاب ہے یہ
یہ منتظر کی طرح ہزاروں
دلوں کی سچی صدا ہے پیارے
ترے نظامِ جدیدیت کا
جدید تر اک ادا ہے پیارے
یہ اضطراب اور جرائتوں کا
بلیغ اعلامیہ ہے پیارے
یہ جوتا! جوتا نہیں ہے پیارے

شفیق احمد شفیق

نظریاتی اور عملی مرقع کشی میں زماں و مکاں پوشیدہ ہے:

ہو مبارک مآل جوتوں کا تجھ پہ اترا وبال جوتوں کا
سر جھکایا ہے اس نے محفل میں جب بھی آیا خیال جوتوں کا

تیرے پہرے سے تیرے پرچم تک — سب نے دیکھا کمال جوتوں کا
اف نشانہ خطا ہوا کیسے؟ — ہائے ! دیکھو ملال جوتوں کا
سر بچا کر بتا دیا نمبر — واقعی ہے کمال جوتوں کا
منتظر تھا جواب کیا دیتا — تیرا حق تھا سوال جوتوں کا
یاد کرتا رہے گا تو برسوں — الوداعی وصال جوتوں کا
بھول جانا محال ہے پھر بھی — لکھ دیا ہم نے سال جوتوں کا
ہاں کوئی میوزیم بنائیں ہم — ایسے ہی بے مثال جوتوں کا
بزم جاناں میں ہو گیا آخر — تذکرہ لازوال جوتوں کا
حکم فلکی پہ آج ہم اطہر — پیش کرتے ہیں تھال جوتوں کا

اطہر عباسی

ذہنی اضطراب نے ظلم واستبداد کے خلاف عملی قدم اٹھانے پر مجبور کیا ہے :

توہین کے ، تحقیر کے ، تذلیل کے جوتے
پھر فیل کے سر پر ہیں ابابیل کے جوتے
''فرعون'' زماں بن کے پھرا کرتا تھا ہر دم
لازم تھا کہ پڑ جاتے اسے ''نیل'' کے جوتے
اسٹیلتھ سے دنیا کو جو دہلائے ہوئے تھا
اے کاش کہ پڑتے اسے اسٹیل کے جوتے
ہر زخم رعونت کی تھی ہیلنگ ضروری
پڑنے تھے اسے جم کے بڑی ہیل کے جوتے
باٹا سے بھی بہتر ہیں اور سروس سے بھی افضل
کہلاتے ہیں دنیا میں جو ''اربیل'' کے جوتے

لازم ہے کہ اب پیر ترے چوم لے دنیا
زیدی ترے پیروں میں تھے سرخیل کے جوتے

نعیم بازید پوری

حدود کا تعین جب بنیاد سے ہٹ جائے تو ایسا ہی منظر آتا ہے :

ایک پل میں یہ افتاد کیسی پڑی
دن میں تارے ہی بش کو نظر آ گئے
دو ہی جوتے پڑے سر پہ اس کے مگر
سارے عالم پہ زیدی ، سحؔر چھا گئے

☆

کہیں عزت نظر نہیں آتی
کوئی اچھی خبر نہیں آتی
جوتے زیدی کے سر پہ کھا کر بھی
شرم بش کو مگر نہیں آتی

☆

واقعہ آج یہ برا نہ ہوا
جا کے عزت میاں زمانہ ہوا
کتنا بے شرم ہے یہ بش بھی سحؔر
جوتیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

☆

فرید سحر

سیاتی کیفیت کی بڑی مثال ایک شعر میں اس طرح ہے :

تھا نشانہ خوب زیدی کا منیر
ایک ہی جوتے میں سلطانی گئی

منیر سیفی

اسی سلسلے کا یہ قطعہ بھی ہے جو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے :

چوریاں اور مسلمان خدا کے گھر میں
چھوڑ دی حاملِ قرآں نے خدا کی ڈوری
ماہ رمضان مبارک کی شب تیرہ کو
حیف صد حیف میرے ہو گئے جوتے چوری

منیر سیفی

اس المناک صورت حال میں نئی صبح کی آمد ہے :

پہن کر پھرا جو صدارت کے جوتے
اسے پڑ رہے ہیں عداوت کے جوتے
نشانہ صحافی کا اچھا نہیں تھا
وگر نہ تو پڑتے قیامت کے جوتے
اچانک وہ اک شب جو بغداد پہنچا
صحافی نے مارے صحافت کے جوتے
وہ گھر سے نکل کر پٹا آدمی سے
جسے گھر میں پڑتے تھے عورت کے جوتے
وہ نفرت کے جوتوں سے پٹ کر جو لوٹا
تو گھر میں پڑے کچھ محبت کے جوتے
جو ملت کو چونا لگاتا ہے یارو
اُسے پڑنے لگتے ہیں ذلت کے جوتے
مکین اور سارا نے دھمکی یہ دی تھی
نہ آنا ، پڑیں گے سیاست کے جوتے
اُسے گھر سے کالے نے آ کر نکالا

جسے پڑ رہے تھے ملامت کے جوتے
یہ بارک اوباما ہے، برکت نہیں ہے
مگر اس نے پہنے ہیں برکت کے جوتے
عرفان مرتضیٰ

کیفیت کے تفکر میں خوش گواری کے ارمان ہیں :

ہے غضب کا خمار جوتوں کا — وار پھر ایک بار جوتوں کا
جانِ من سن ، ابھی تو باقی ہے — سامنا بے شمار جوتوں کا
شہرِ خوباں کا قصد اب جو کرو — پہن لو ایک ہار جوتوں کا
بے بسی انتہا کی تھی لیکن — چل گیا اختیار جوتوں کا
ایسے گھٹیا کے سر پہ کیوں مارا — کیوں گھٹایا وقار جوتوں کا
پڑتے جوتے کا تاڑ لے نمبر — کتنا ماہر ہے یار جوتوں. کا
سارے عالم کے میڈیا پر اب — چڑھ چکا ہے بخار جوتوں کا
پیار کا اپنا اپنا ہے انداز — ہم جتاتے ہیں پیار جوتوں کا
بولیاں لگ رہی ہیں جوتوں کی — واہ رے اعتبار جوتوں کا
کیجیو شکر بات اسی پہ ٹلی — جا کے صدقہ اتار جوتوں کا
اے زمانے کے باقی فرعونو! — کیجیو انتظار جوتوں کا

اعجاز شاہین

وسیع تر آ گہی نے مفاد کو ترجیح دی ہے :

بازار کو میں اِک دن نکلا تھا بے ارادہ
موٹر نہ سائیکل تھی یونہی تھا پا پیادہ
سوچا کہ آ گیا ہوں جب میں یہاں تو لے لوں
بیگم کی جوڑی چپل جس کا کیا ہے وعدہ

میرا بھی اپنا جوتا بالکل ہی گھس چکا تھا
داغ مفارقت وہ دینے پہ اب تلا تھا
چپل کے ساتھ جوتا لے لوں تو کیا برا ہے
دیکھا اِدھر اُدھر تو اک بورڈ پر لکھا تھا

مضبوط اور ٹکاؤ جوتے کی یہ دکاں ہے
جوتے کے ساتھ ملتی چپل فری یہاں ہے
یہ دیکھ کر گھسا میں جوتے کی اس دکاں میں
بولا ہے کیسا جوتا چپل بھی وہ کہاں ہے

دونوں کی منھ دکھائی جلدی ذرا سا کردیں
ویٹنگ میں ہے لگائی جلدی ذرا سا کردیں
اس کا ہے حکم آکر فوراً سے پیشتر ہی
گھر کی کریں صفائی ، جلدی ذرا سا کردیں

نٹ کھٹ عظیم آبادی

مذہب وملت کے عشق کی اسے کرشمہ سازی ہی کہیے :

کوئی معصوم سی خوشبو
کسی تازہ ہوا کا لمس تھا وہ
یا اک شاعر، کوئی ناقد
کہ پھر کوئی مورخ
وہ جو بھی تھا کہ اک فنکار بھی تھا
اور اس دن اس نمائش میں

سبھی آنکھیں جب اس تصویر کی توصیف پر مامور تھیں

کہ جس کے رنگ وروغن کے پس منظر سے

جو چہرہ جھانکتا تھا

وہ اس مغرور سے اور سرکشیدہ شخص کا تھا

جواب سے پہلے آنے والے سب خداؤں کی طرح اپنا

زمیں پر آخری فرمان لیکر آیا تھا

مگر اس کی چمکتی وحشی آنکھوں میں

جو نفرت کھیلتی تھی

کہ اس کے بے رحم ہونٹوں پہ پھیلی مسکراہٹ سے

حقارت کا جو جذبہ جھانکتا تھا

وہ اس اہل نظر کی غیرتِ فن کو ادھورا سا لگا

تب اس نے پاؤں سے جوتے اتارے

پھر اس تصویر کے چہرے پر دے مارا

وہ چہرہ اب مکمل تھا

وہ جوتا

جو کہ اس تصویر کے چہرے پہ جا کر جڑ چکا تھا

کسی تاریخ کا حصہ ہے اب

اور اس تصویر کا ٹوٹا ہوا چہرہ

کسی بے خوف خالق کا

کوئی بے مثل سا شہکار

سلام کہتی ہے دنیا تجھے مرے فنکار!......

سرور حسین

جسارت کی آندھی نے جو وقتی فیصلہ کیا ہے وہ تند و تیز سیلاب سے بڑھ کر ہے :

ہتھیار کی دنیا کا جواں پیر ہے جوتا
تلوار ہے خنجر ہے کماں تیر ہے جوتا
مرگی سے شکایت میں اکسیر ہے جوتا
ہر خواب سا مراج کی تعبیر ہے جوتا
تہذیب کو خطرہ ہو تو جوتا ہی دوا ہے
ہر ایک درندے کے لئے جوتا روا ہے

☆

جب سامنے قاتل ہو تو جوتا ہی چلیگا
جب توپ مقابل ہو تو جوتا ہی چلیگا
بندوق نہ حاصل ہو تو جوتا ہی چلیگا
سینہ میں اگر دل ہو تو جوتا ہی چلیگا
جب صفحہ گیتی پہ کبھی پاپ پلیگا
جوتا تو چلیگا بھئی ، جوتا تو چلیگا

☆

اقوام کی مجلس میں کبھی جوتا تنا تھا
کیوبا کا نگہبان بھی جوتا ہی بنا تھا
سینے میں کنیڈی کے اگر خوف گھنا تھا
وہ خوف فقط ایک ہی جوتے نے جنا تھا
جوتے کی کرامات کی کیا پوچھنا بھائی
ایٹم بموں کی شان بھی جوتے نے گھٹائی

☆

روداد تجھے یار میں ایک دن کی سناؤں
جوتے کی کہانی کو ذرا آگے بڑھاؤں
نایاب کیا بوسہ تھا وداعی کا، دکھاؤں
ای شیر نر کے حوصلے پہ داد لٹاؤں
اس شام چلا اس طرح بغداد میں جوتا
ڈر بو ہی گیا سینۂ جلاد میں جوتا

☆

مکار تھا مکاری سے وہ باز نہ آیا
جوتے جو پڑے انکو فقط کھیل بتایا
سینے میں اُگے خوف کو چہرے پہ نہ لایا
سچ ہے یہ مگر اس نے فقط جوتا کمایا
بغداد کا ہو خواہ یا پیشاوری جوتا
دس نمبری کا مل گیا ۱۰ نمبری جوتا

☆

انساں کا لہو گرچہ ہے بے دردی سے بہتا
مقدور بھر انسان اسے پھر بھی ہے سہتا
اللہ جو خنزیر کو ممنوع نہ کہتا
خنزیر بھی بُش جیسا سلامت نہیں رہتا
ہے جدو جہد فطرتِ انسان میں داخل
لڑنے کے لئے کافی ہے گر جوتا ہے حاصل

☆

اب سام کے چمچوں کے لئے وقت کڑا ہے
اب سوچ میں غرقاب ہر ایک چکنا گھڑا ہے
آقا کے نمائندے پہ اگر جوتا پڑا ہے
ہر چمچہ بھی جوتے کے نشانے پہ کھڑا ہے
سردار یا زردار کبھی ہوش میں آئیں
کچھ نام کمائیں ، کبھی جوتا نہ کھائیں

نریش ندیم

اس تھپتھپاہٹ میں تیموری جاہ کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے :

اے مرے جوتے مرے ہمدم مرے دیرینہ یار
اے میرے پائے شکستہ کے انیس وغم گسار
آج تیری خستہ حالی نے یہ ڈھایا ہے ستم
کر رہا ہوں میں جدا تجھ کو بہ چشم اشک بار
کیا کروں مجبور ہوں تیرے ہزاروں ہول سے
میرے تلوے ہی نکل پڑتے ہیں باہر سول سے
تو کہ پچھلے آٹھ برسوں سے تھا میرا ہمسفر
ایک پل بھی جدائی تھی گراں اعصاب پر
ہاٹ ہو ، بازار ہو، دفتر ہو یا بیت الخلاء
تجھ کو پاؤں سے لگائے رکھتا تھا شام وسحر
جب بھی مسجد میں عبادت کو پہنچتا میں غریب
تجھ کو رکھ دیتا تھا پیچھے عین پیروں کے قریب
میری خاطر کتنے غم کی کشتیاں کھیتا تھا تو
ٹھوکریں لگتی تھیں مجھ کو سسکیاں لیتا تھا تو
وضع داری کا یہ عالم تھا کہ لغزش پر مری
راستے بھر کی غلاظت خود پہ مل دیتا تھا تو
آج لیکن وہ روایت کشتۂ تنقید ہے
تیرے بدلے اب مجھی پر جانور کی لید ہے
تیری قیمت کب ادا ہو پاتی مجھ کنگال سے
وہ تو نکلی تھی سسر صاحب کے بیت المال سے
تیری خاطر کر لیا تھا میں نے ایجاب وقبول
اک عدد بیگم بھی لے آیا تھا میں سسرال سے
جلد بازی تو نے کی بیگم سے سبقت لے گیا
وہ سلامت رہ گئیں تو داغ فرقت دے گیا
ہو گئی تھی خستگی اب تیری صحت میں دخیل
جوڑ بند ادھڑے ہوئے اکھڑی ہوئی ہر ایک کیل
سول چھلنی ہو چکے تھے مستقل گھسنے کے بعد
راہ میں گم ہو چکی تھی داہنے پاؤں کی ہیل

خوف سے موچی بھی رہتا تھا نظر گاڑے ہوئے
جب اسے تو دیکھتا تھا اپنا منہ پھاڑے ہوئے

عام ہے چڑھتی گرانی کا جو چرچہ آجکل
صاف ظاہر ہے نہ مل پائے گا پھر تیرا بدل

سوچ بھی سکتا نہیں میں دوسری شادی کی بات
تو بخوبی جانتا ہے ایک کا ردِ عمل

میں برہنہ پائی کی چکی میں اب پس جاؤں گا
رفتہ رفتہ ایک دن تیری طرح گھس جاؤں گا

......اسمٰعیل آزر

جوتے مارنا ہمہ گیر دانش ورانہ بصیرت کا معنی خیز اشاریہ ہے۔ یہ کرمک شب تاب کا طرۂ امتیاز ہے جسے شاعروں نے ارتکازِ فکر سے مالا مال کیا ہے۔ ایک اور مثال دیکھئے :

میرا جوتا پھٹ گیا اک دن بھرے بازار میں
میں نے جلدی سے لپیٹا اس کو اک اخبار میں
پاؤں سر پر رکھ کے جوتے کی دکاں پر چل پڑا
زیرِ لب پاکٹ پہ اپنی فاتحہ پڑھتا ہوا
دیکھتے ہی مجھ کو یہ کہنے لگا دکاندار
آیئے صاحب، یہاں رکھے ہیں جوتے بے شمار
ہے پہننا فیشن ایبل نوجواں لیڈیز شو
کوئی بوڑھا بھی اگر پہنے لگے گا خوب رو
آپ تو کچھ کچھ نمازی لگتے ہیں فرمایئے
مسجدوں میں چوری ہونے والا جوتا چاہیے؟
لیجئے، اس کو پہنیئے، عالمانہ بوٹ ہے
یہ پسند آئے تو نوّے فی صدی تک چھوٹ ہے
''حاجی'' ہونا ہے تو یہ جوتا پہن کر جایئے
اس کے تلے میں چھپا کر اصلی سونا لایئے
لیجئے اس سے پھٹے پاؤں کی عزت ہوتی ہے

ایسے ہی جوتوں سے بیوی کی مرمت ہوتی ہے
لیجئے اس کو اگر ہے دل میں شوق لیڈری
پارلیمنٹ ہاؤس میں چلنے والا جوتا ہے یہی
دیکھئے چپل یہ مہنگا ہے مگر ٹکتا نہیں
مانگ اتنی ہے کہ اب یہ مال بھی ملتا نہیں
لیجئے یہ ناگرہ اچھا ہے یہ سستا ہے یہ
اس میں خوبی یہ ہے کہ موچی کے گھر رہتا ہے یہ
میں نے اپنے دل میں یہ سوچا کہ چلنا چاہئے
اس زمانے میں تو ننگے پاؤں رہنا چاہئے
پھر وہ بولا ایسا گاہک آج تک پایا نہیں
اتنے جوتوں میں کوئی جوتا پسند آیا نہیں
لیجئے ماڈل نیا، بنتی ہے اس جوتے میں دال
مارکٹ میں اک زمانے سے پڑا ہے اس کا کال
یہ نیا ماڈل منسٹر چھاپ ، کل ہی آیا ہے
کرکے پالش ہر ایم ایل اے نے اسے چمکایا ہے
لیجئے چپل ہوائی اب یہ ملتا ہی نہیں
اس کو شاعر کے سوا کوئی پہنتا ہی نہیں
شعر لکھنا ہو تو مشکل ساری حل ہو جائے گی
پہنئے اس کو ابھی تازہ غزل ہو جائے گی
ٹوٹ کر بھی کام آتا ہے سیاسی راہ میں
پھینکا جاتا ہے یہ نیتاؤں کی جلسہ گاہ میں
چند ماڈل اور ہیں رکھے ہیں جو گودام میں

پہنے جاتے ہیں مگر یہ گردشِ ایام میں
دیکھنے دہلی سے آیا ہے بہت اونچا ہے دام
یہ وہ جوتا ہے جسے کھاتے ہیں بھارت کے عوام
پھر مجھے جوتا دکھا کر بولا وہ دکاندار
جیب میں پیسے نہ ہوں صاحب تو لے لیجئے اُدھار
کب کہا میں نے کہ قیمت آج بتلا دیجئے
کل یہاں آؤں تو مجھ کو چار جوتا دیجئے

......مختصر اعظمی

اس سے انکار ممکن نہیں ۔ ہے کہ جوتا زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ جوتے کی ظہور پذیری میں وقت قیام پوشیدہ ہوتا ہے۔ ایک کیفیت یہ بھی ہوتی ہے :

- پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح کوئی
  جوتے سے ڈر رہی ہوں کہ جوتا گزیدہ ہوں
- جوتے کے نام سے اب مجھ کو بخار آتا ہے
  اور ہوں گے وہ جنہیں جوتے کے ارماں ہوں گے

......نینا جوگن

منتظر زیدی نے جو احتجاجی فضا پیدا کی وہ عریض و بسیط دنیا تک پھیلی اور عالمی سطح پر اردو کے شاعروں نے اس کی جرأت کو سراہا :

منتظر یہ زیدی ہے جیسے شعلہ ہیرے میں
سب کے جوتے شامل ہیں اس کے ایک جوتے میں

......ستار صدیقی

ذہن و شعور کا یہ مظہر جذبۂ فزوں تر کی مثال ہے :

عورتیں ماریں، جواں مارے کہ بوڑھا مارا ایک دجال نے اک ملک میں کیا کیا مارا

غیرتیں قوم کی مرنے کو جو تھیں جاگ اٹھیں — اک جیالے نے جو دجال کو جوتا مارا

......احمد قادری

آخرش عربوں میں اک مرد خدا پیدا ہوا — جس نے جوتے سے کیا بش کے مدکا ئد کا علاج
اس حکیمِ نکتہ رس نے قوم کو سکھلا دیا — اس طرح بھی کرتے ہیں بیمار قائد کا علاج

......مضطر مجاز

یہ ذہانت کی دلیل ہی ہے۔ جس کے معترف بھی ہیں :

منتظر تو نے بھی کیا خوب لگائے جوتے — ساری دنیا میں عجب دھوم مچائی تو نے
شان ہر ملک میں اپنی وہ جتاتا تھا بہت — ساری شان اس کی جوتی میں ملائی تو نے

......نور الدین امیر

جوتا کثیر الاوصاف موضوع ہے۔ جس میں مواد کی نیرنگیاں ہیں۔ اب تو یہ بلند ہمتی پر محمول ہے!

جوتے پر محاورے بہت ہیں۔ اور رسومات بھی بہت رائج ہیں۔ ان میں سے اکثر کی تاریخ بیحد پرانی ہے۔ ایسی تمام رسومات میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ ان میں جوتے کا کردار کلیدی ہے۔ مثلاً :

جوتیاں سیدھی کرنا : یہ رسم جوتے کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ادا کی جاتی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ماضی میں یہ رسم اہل علم کے جوتوں سے متعلق تھی اور لوگ صاحبانِ علم و دانش کی جوتیاں سیدھی کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے، لیکن وقت کے تقاضوں کے ساتھ یہ رسم بدلتے بدلتے اہلِ ثروت و اقتدار کے جوتوں پر آ کر ٹھہر گئی۔ آج کل اہلِ دانش و حکمت کے جوتے اس لئے بھی سیدھے نہیں کئے جاتے کہ وہ (اقتصادی وجوہ کی بنا پر) خاصے بوسیدہ ہوتے ہیں اور ان سے ہاتھ خراب ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ نیز اصحابِ علم و آگہی خود بھی اس کی اجازت نہیں دیتے مبادا کہ جوتے سیدھی کرنے والا انھیں لے کر ہوا ہو جائے۔

جوتیاں چاٹنا : یہ رسم عام طور پر اس وقت ادا کی جاتی ہے جب کسی صاحب اختیار یا حامل جوتا سے غرض یا مفاد وابستہ ہو۔ مطلب حاصل کرنے کے لئے جوتیاں چاٹنا یا بدونِ سینگ ایک جانور کو باپ بنالینا، ایک ہی مفہوم کی رسوم ہیں۔ رسم بذادر بارداری کے تقاضے پورے کرنے کے

لئے بھی ادا ہوتی ہے۔

جوتے چھپانا : یہ سب سے مقبول عوامی رسم ہے جو شادیوں سے لے کر مسجدوں تک بغیر کسی وقفے کے جاری ہے۔تاہم اس رسم کا مستقبل زیادہ تابناک نہیں۔دراصل جوتے اتنے مہنگے ہوگئے ہیں کہ وہ وقت دور نہیں جب لوگ ننگے پاؤں اپنی شادیوں اور مسجدوں میں جائینگے۔

جوتے گھسانا : یہ خالصتاً عوامی رسم ہے۔خواص کو اس سے پالا نہیں پڑتا۔یہ رسم سرکاری دفتروں میں ادا کی جاتی ہے۔سائلان کی درخواستیں سرکاری اداروں میں میز در میز رسوا ہوتی ہیں اور وہ ان دفاتر کے چکر پہ چکر لگا کر اپنی جوتیاں گھساتے رہتے ہیں۔کبھی شناختی کارڈ حاصل کرنے کے لئے، کبھی بجلی کا بل ٹھیک کرانے کے لئے اور کبھی انصاف کے حصول وغیرہ وغیرہ کے لئے۔

جوتے چھوڑ کر بھاگنا : اس رسم کا تعلق عشاق عظام سے ہے۔پیشہ ور عشاق کو نہ چاہتے ہوئے بھی یہ رسم ادا کرنا پڑتی ہے۔رسم مذکور کو دہرانے میں کیدو کی نسل کا کلیدی کردار ہے۔دو دلوں کے ملاپ کی تقریب سعید کے دوران کیدو اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں اور عاشقوں کو اپنے جوتے وہیں چھوڑ کر بھاگنا پڑتا ہے۔

جوتے کی نوک پر رکھنا : یہ بھی ایک قدیم رسم ہے۔اگرچہ نوکدار جوتے کا رواج کم ہوگیا ہے لیکن رسم ہذا کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی۔اس کا تعلق ارباب اقتدار و اختیار سے ہے۔ان کے جوتوں کی نوکیں اتنی مضبوط ہوتی ہیں کہ وہ کروڑوں لوگوں کے مسائل اور جذبات کا بوجھ باآسانی سہار سکتی ہیں۔

جوتے کے برابر سمجھنا : اغراض ومقاصد اور مفہوم میں یہ رسم، رسم بالا (جوتے کی نوک پر رکھنا) سے مماثلت رکھتی ہے۔یہ رسم بھی خواص ہی ادا کرتے ہیں۔عوامی مسائل اور مطالبات چاہے پہاڑ جتنے ہوں مگر ارباب بست وکشاد انہیں حجم میں اپنے جوتوں کے برابر سمجھتے ہیں۔

جوتا بدلنا : یہ ایک مقبول عام رسم ہے، جسے ہر خاص وعام اپنی استطاعت کے مطابق ادا کرتا ہے۔امیر آدمی نئے ڈیزائن آنے پر جوتا بدلتا ہے جبکہ غریب جوتا پھٹ جانے پر ایسا کرتا ہے۔بعض لوگ اس رسم کو دوسری شادی کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔

جوتے چلانا : یہ رسم اس وقت ادا کی جاتی ہے جب مذاکرات ناکام ہو جائیں۔ جرگوں سے لے کر اسمبلیوں تک، جب مسائل گفت وشنید سے حل نہ ہو سکیں تو جوتے چل جاتے ہیں۔ مذکورہ رسم کی ادائیگی سے قبل گالی گلوج لازمی ہے۔

جوتے سنگھانا : مرگی کے دورے میں یہ رسم مفید تصور کی جاتی ہے۔ اکثر عامل حضرات مریضوں کو جن پڑ جانے پر جوتا سنگھاتے ہیں۔ اگر مریض کو افاقہ نہ ہو تو عامل یہ کہتے ہوئے اسی جوتے سے مریض کی مرمت شروع کر دیتے ہیں کہ ''جن بہت طاقتور ہے۔'' حالانکہ جن یا بھوت کبھی بھی عاملوں سے طاقتور نہیں ہوتے۔ اگر ایسا ممکن ہو تو جن وہی جوتا لے کر عامل صاحب کی خیر خیریت دریافت کرنا نہ شروع کر دے؟

..................☆..................

جمہوریت کے نام پر جوتے، انصاف کے نام پر جوتے، ترقی کے نام پر جوتے، روزگار کے نام پر جوتے، سرکاری دفتروں میں جوتے، پولیس ناکوں پر جوتے، لوڈ شیڈنگ کے جوتے، آٹا بحران کے جوتے، مہنگائی کے جوتے...... جوتے ہی جوتے...... اس رسم کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ عام آدمی بھی (موقع ملنے پر) رسم ہذا کے ذریعے اپنے جذبات کے اظہار کا موقع ضائع نہیں کرتا۔ قانون فطرت ہے کہ انسانوں کے جذبات کو جوتے کی نوک پر رکھنے والوں کا مقدر جوتے ہی ہوتے ہیں۔

جوتے کی اس تفصیل پر یاد آیا کہ یوروپین اردو رائٹرز سوسائٹی، لندن کی دعوت پر میں برطانیہ گیا تھا۔ لیکن جانے سے قبل جوتے کے سلسلے میں ایک حادثہ پیش آیا تھا۔ صوبہ بہار کے وزیر صحت ڈاکٹر شکیل احمد نے کل بہار مشاعرہ، بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ کے ہال میں کرایا تھا جس میں میں بھی مدعو تھا۔ تب میرے لندن جانے کا پروگرام بن چکا تھا۔ میری بیگم میرے جانے کی تیاری میں لگی ہوئی تھیں۔ ایک دن بازار لے جا کر انہوں نے پانچ سو پچانوے روپے میں نیا جوتا خریدوایا۔ اور جب میں مشاعرہ میں پٹنہ جا رہا تھا تو انہوں نے یہ کہہ کر نیا جوتا پہننے پر اکسایا کہ لندن جانے سے قبل اسے چند دن پہن لوں، کہیں کاٹ واٹ نہ لے...... مشاعرہ ختم ہونے سے قبل منتظمین نے مجھے اسٹیج

سے یہ کہہ کر بلایا کہ نذرانہ لے لوں۔ نیچے اتر کر جوتا ڈھونڈا تو ندارد، کسی نے بتایا کہ ڈاکٹر اعجاز علی ارشد نے کلاس فیلو ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جوتا غائب کر دیا ہے۔ میں ان کے سینڈل پہن کر منتظمین کے پاس جا بیٹھا۔ اعجاز علی ارشد کسی دوسرے کی چپل پہن کر میرے پاس آ گئے اور اپنی صفائی دینے لگے۔ جن کی چپل پہن کر وہ آئے تھے ان صاحب نے کسی اور کی زیر پائی کو اپنے پیر میں ڈال کر تلاش شروع کی۔ غرض مشاعرہ ختم ہوتے ہوتے ہر کسی کی زبان پر تھا کہ شاعروں کے جوتے چپل غائب ہو گئے ہیں۔ سامعین کے جانے کے بعد ہال کی صفائی شروع ہوئی تو ایک کرسی کے نیچے سے پھٹا پرانا جوتا ملا جسے اکیڈمی کے چپراسی نے پہچانا کہ یہ صدیق مجیبی کا جوتا ہے۔ ان کی بس نو بجے تھی اس لئے ابتدا میں ہی مشاعرہ پڑھ کر وہ رانچی جا چکے تھے۔ مجبوراً وہی پھٹا جوتا مجھے پہننا پڑا۔ اگلی صبح ٹانکے ڈلوا کر اور پالش کروا کر میں بھاگلپور لوٹ آیا۔ حالانکہ اس دن مجھے پٹنہ رکنا تھا لیکن میرا موڈ اتنا آف ہوا کہ پٹنہ میں نہیں رک سکا۔ اگلے ہفتہ روزنامہ ''قومی تنظیم'' پٹنہ میں اپنے مستقل کالم ''مجھے بولنے دو'' کے تحت مشہور افسانہ نگار، صحافی اور کالم نویس رضوان احمد نے طنزیہ لکھا۔ عنوان تھا ''اپنے جوتوں سے رہیں سارے شاعر ہوشیار۔'' رضوان احمد کی پوری تحریر درج کر رہا ہوں جس کی عبرتناکی غور طلب ہے :

''ریاستی وزیر صحت ڈاکٹر شکیل احمد کو افسوس تھا کہ وہ وزارت کا حلف اردو زبان میں نہیں لے سکے تو اس کا کفارہ ادا کرنے کے لئے انہوں نے ایک مشاعرہ کرانے کا پروگرام بنایا۔ اور اس سلسلے میں جب مجھ سے مشورہ کیا تو میں نے کہا کہ یہ خیال بہت اچھا ہے۔ کیوں کہ بے چارے شعرا حضرات بڑے غیر صحت مند رہتے ہیں۔ اور جب وزیر صحت ان کی دادرسی کے لئے آگے آئے گا تو ہو سکتا ہے کہ ان کی صحت بھی بہتر ہو سکے۔ انہوں نے مشاعرے کی بہت سی ذمہ داریاں میرے سر ڈال دیں اور اسے انہوں نے یوم عالمی آبادی کے موقع پر منعقد کیا اور شعرا سے یہ کہا گیا کہ وہ خاندانی منصوبہ بندی کے موضوع پر بھی اشعار پڑھیں۔ مجھے ان کی اس فرمائش پر تھوڑی ہنسی آئی اس لئے کہ شاعر اور خاندانی منصوبہ بندی کچھ متضاد چیزیں ہیں۔ بلکہ اس پر مجھے غلام احمد فرقت کاکوروی کی مشہور نظم یاد آ گئی جو انہوں نے خاندانی منصوبہ بندی پر کہی تھی :

ہم سب فقیروں کو یہاں　　اتنی بھلا فرصت کہاں
اولاد بھی پیدا کریں　　اور بیٹھ کر سوچا کریں
یہ سب کہاں سے کھائیں گے　　پیسے کہاں سے لائیں گے
اس سے ہمیں کیا واسطہ　　یہ کام ہے سرکار کا

اور سرکار کے وزیر باتدبیر نے اس بہانے شعراء کی کچھ دادرسی بھی کردی۔

مشاعرہ بہت کامیاب رہا۔ تین درجن شعراء تشریف لائے۔ لیکن اس مشاعرے میں ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا کہ بھاگلپور سے تشریف لائے مشہور ادیب وشاعر ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا جوتا چوری ہوگیا۔ اب تک تو میں نے مسجد کے بارے میں یہ سنا تھا کہ وہاں سے جوتے چوری ہو جاتے ہیں۔ اسی پر کسی شاعر نے کہا تھا:

اپنے جوتوں سے رہیں سارے نمازی ہوشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

لیکن اب مشاعروں میں بھی جوتے چوری ہونے لگے ہیں۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اس واقعہ سے بہت دل گرفتہ تھے کیونکہ انہوں نے ابھی یہ نیا جوتا لندن جانے کے لئے خریدا تھا۔ جہاں سے انہیں ایک سیمینار میں شرکت کا دعوت نامہ ملا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اب ان کا جوتا چوری ہو گیا ہے تو وہ بغیر جوتوں کو کیسے تشریف لے جاسکیں گے۔ بہرحال مشاعرے میں ان کا جوتا تو چوری ہوگیا لیکن جب مشاعرہ ختم ہوا تو پتہ چلا کہ ان کے نئے جوتوں کے بدلے میں ایک جوڑا منھ پھاڑے پڑا ہے۔ مجبور ہو کر وہی جوڑا انہوں نے موچی سے سلایا اور اسے پہن کر بھاگلپور تشریف لے گئے۔ انھیں مشاعرے میں اشعار پڑھنے کا معاوضہ تو ضرور ملا لیکن اب وزیر موصوف پر واجب ہے کہ وہ ان کے جوتے کا بھی معاوضہ ادا کریں کیونکہ اس کے بغیر ان کا لندن جانا ممکن نہیں ہے۔ اور ہمارے وزیر صحت بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ غیر ملک میں کیسا جوتا پہنا جاتا ہے۔ اس لئے کہ ان کی سسرال ہی امریکہ میں ہے۔ اور وہ اکثر امریکہ، لندن، کناڈا تشریف لے جاتے رہتے ہیں۔

خاندانی منصوبہ بندی کا یہ مشاعرہ ایک شاعر کو بہت مہنگا پڑا ہے۔ حالانکہ بے چارے مناظر

عاشق ہرگانوی شروع سے ہی خاندانی منصوبہ بندی کے اصولوں پر سختی سے کار بند رہے ہیں۔ لیکن اس مشاعرے میں انھیں انعام ملنے کے بجائے سزا مل گئی۔ ایسی کڑی چوٹ پڑی کہ وہ تلملا کر رہ گئے ۔ اور رات بھر اس کا سوگ مناتے رہے۔ اگلے دن یہ سراغ لگانے کی کوشش کی کہ ان کا جوتا کون شاعر لے اڑے۔ بعد میں ایک صاحب نے شناخت کرنے کے بعد بتایا کہ یہ جوڑا باہر سے تشریف لائے ایک شاعر کا ہے جو ہر وقت عالم کیف میں رہتے ہیں۔ اور اسی عالم میں وہ اپنے منھ پھاڑ جوتے کے بجائے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا نیا جوتا پہن کر چلے گئے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب ان جوتوں کی ادلا بدلی کیسے ہوگی۔ اس لئے کہ ایک شاعر تو نئے جوتے پا کر بہت مزے میں ہے۔ لیکن دوسرے شاعر کا زیاں ہی زیاں ہے۔

جوتوں کی گمشدگی پر مجھے اکبر الٰہ آبادی کا وہ شعر بھی یاد آ رہا ہے ؛

بوٹ ڈاسن نے بنایا میں نے اک مضمون لکھا
ملک میں مضموں نہ پھیلا اور جوتا چل گیا

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے تو ہزاروں مضامین لکھے ہیں ...... لیکن ابھی انہیں ڈاسن کے جوتے کی فکر نہیں بلکہ اپنے جوتے کی فکر ہے جو چل نہیں گیا بلکہ چلا گیا ہے۔ اب ان کی دادرسی کون کرے گا؟ البتہ یہ سارے شاعروں کے لئے لمحہ فکریہ ہے کہ وہ جب مشاعروں میں جائیں تو اپنے جوتوں کی بھی حفاظت کریں۔"!

جوتے کے سلسلے میں اور بھی یادیں تازہ ہو رہی ہیں۔ فراق گورکھپوری، رام موہن رائے سمینری، پٹنہ میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ مشاعرہ میں قریب دس ہزار کا مجمع تھا۔ فراق کو کافی داد مل رہی تھی۔ اس لئے وہ پڑھے ہی جا رہے تھے۔ جب کافی دیر ہوگئی اور کھڑے کھڑے وہ تھک گئے تو پڑھتے پڑھتے مائک کے پاس ہی بیٹھ گئے۔ ان کے بیٹھنے کے بے ساختہ انداز پر سامعین کی ہنسی چھوٹ گئی۔ فراق نے برجستہ کہا :

حضرت داغ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے
دو چار جوتے بھی پڑے پھر بھی نہ اٹھے اینٹھ گئے

سری نگر میں مظہر امام کے یہاں خلیل الرحمٰن اعظمی، فیاض رفعت، مجید مضمر، مناظر عاشق ہرگانوی اور کئی حضرات بیٹھے ہوئے تھے۔ باتیں فحش نگاری پر ہو رہی تھیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے دوران گفتگو کہا ''جب فحش نگاری کے سلسلہ میں لاہور کی عدالت میں عصمت اور منٹو پر مقدمہ چلا تو ان کو اس سلسلے میں دو مرتبہ لاہور جانا پڑا۔ یہ حضرات دونوں مرتبہ وہاں سے سینڈلیں خرید کر لائے۔ ایک صاحب نے بمبئی میں عصمت سے پوچھا'' کیا آپ لوگ لاہور مقدمہ کے سلسلے میں گئے تھے؟''

''جی نہیں۔ جوتے خریدنے گئے تھے۔'' عصمت کا جواب تھا!

☆

جوتے کی اقسام اور انتقام پر مشہور مزاح نگار یوسف ناظم نے اپنے زاویے سے نظر ڈالی ہے :

کہانی طویل ہے اور ہمارے آج کے ترقی یافتہ جوتوں کی جڑیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ آدمی قرنہا قرن تک پتھریلی اور بے ہنگم فرش زمین پر ننگے بدن اور ننگے پاؤں چلتا رہا۔ صرف انجیر کے پتوں نے اس راندۂ بارگاہ خداوندی کی تھوڑی بہت مدد کی۔ پاپوش نامے کا یہ باب خاصا دردناک تھا۔ آبلہ پائی کا مزا چکھنے میں آدمی کے صبر کا پیمانہ صدیوں تک لبریز ہو ہو کر بار ہا چھلکتا رہا۔ ہماری تحقیق کے مطابق آدمی کو پیروں میں پہننے کی اولین چیز جو حاصل ہوئی وہ کھڑاویں تھیں ورنہ اس سے پہلے وہ محروم الکفش تھا۔ رامائن میں کھڑاؤں کا ذکر ملتا ہے۔ اور وہ بھی نہایت محترم نوعیت کا۔ راجہ رام چندر جی جب طویل مدت کے بن باس پر تھے اُس وقت اُن کے عقیدت مند اور وفادار بھائی نے اُن کی کھڑاویں، راج گدی پر رکھ دی تھیں۔ ہمارے زیر نظر پاپوش نامے کی بنیاد یہی کھڑاویں ہیں اور اِنھی سے پاپوش سازی کی صنعت کا آغاز ہوا۔ کھڑاویں، آج بھی رواج میں ہیں۔ یہ بھیگتی ہیں، شرابور ہو جاتی ہیں، لیکن خستہ و بوسیدہ نہیں ہوتیں۔ یہ چرمی نہیں ہوتیں چوبیں ہوتی ہیں اور کیا تعجب یہ شیشم نام کے قد آور درخت کے تنے یا کسی دبیز ٹہنی کا پھل ہوں۔ جب تک گھروں میں فرش پر شاہ آبادی پتھر یا ٹائلز (Tiles) نصب نہیں کیے گئے یہ کھڑاویں گھروں میں زیر استعمال رہیں۔ اب یہ عبادت گاہوں کی رونق ہیں اور ان کا موروثی تقدس حسب سابق برقرار ہے۔ اپنی اسی خاصیت کی وجہ سے کھڑاویں تادیر و ماہ رہتی ہیں اور مشکل سے دغا دیتی ہیں۔ بس ان میں ٹوٹ کر

محنت کرنا نہیں آتا۔ ہماری سمجھ میں آج تک یہ نہیں آیا کہ آدمی ٹوٹ کر کیسے محنت کرتا یا کرسکتا ہے اور ایسے شکستہ و ریختہ سخن کی محنت سے فریق ثانی کو کیا فیض پہنچ سکتا ہے۔ کھڑاؤں کے ارتقاء پر ہمیں جو خوشی ہوئی اس کا اندازہ عام آدمی کے بس میں نہیں ہے۔ آج یہی رسم شادمانی اور مسرت کی جس کیفیت سے سرشار ہو کر اُس کیفیت کو الفاظ کا جامہ پہنانے سے قاصر ہیں۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ ہماری خوشی کا ٹھکانہ نہیں ہے۔ اور اس کی وجہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ عہد عشق کی یہ روایتی چوبی کھڑاویں آج اکیسویں صدی عیسوی میں کارجہاں کی طرح کا طویل و دراز سفر طے کر کے ''مبدل بہ دم گرم'' ہو چکی ہیں اور ان کا جادو بڑے بڑوں کے سر چڑھ کر بہ آواز بلند اعلان کر رہا ہے کہ اب ہمارے منہ کوئی نہ لگے۔ کیسے کیسے سرپھرے سربراہوں کو آج کے ترقی یافتہ صنعتی دور میں ان بے جان اور بے ضرر کھڑاؤں کی پائیدار مضبوط اور خوش شکل جوتوں کی ساخت اور اپنے آپ کو ان کا نشانہ بنتے دیکھ کر اپنا انا آلودہ سر ادب سے جھکانے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس داستان جمیل کی باتصویر روداد ٹیلی ویژن اور ہر چھوٹے بڑے اخبار کے صفحوں پر جلی حروف میں جلوہ افروز ہو چکی ہے۔ تاریخ عام کے صفحات اس نوع کی واردات کے اندراج سے اب تک محروم تھے۔ جوتوں ہی نے اس کمی اور کوتاہی کا ازالہ کیا۔ جوتے پہلے بھی چلے اور چلتے رہے ہیں لیکن آج جس سبک رفتاری سے کہ یہ چل رہے ہیں سابق میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ جوتوں کو جاہ و حشمت کے زینے پر پہنچانے کا سہرا جن دو ''عمائدین'' کے سر ہے اُن میں سے ایک کا نام لیتے ہوئے ہمارا نطق ہماری زبان کے بوسے لیتا ہے اور دوسرے شخص کا نام لیتے ہماری زبان گنگ ہو کر رہ جاتی ہے۔ واہ میں گواہ کے حروف شامل ہیں لیکن ہماری واہ ان دو حرفوں سے مسخر اور منزہ ہے۔ حقیقت منتظر کو لباس مجاز میں دیکھ دیکھ کر ہم کیا، مخلوق خداوندی عش عش کر اُٹھی۔

جوتوں کی قسمیں : اگر دنیا بھر میں مروجہ جوتوں کی فہرست جسے انسائیکلو پیڈیا کہنا چاہئے مرتب کی جائے تو دنیا میں کاغذ کا قحط پڑ جائے گا۔ یہ سب سے زیادہ ضخیم فرہنگ ہوگی۔ یوں بھی ہمارا علم اس معاملے میں کئی اور معاملوں کی طرح نہایت ناقص ہے۔ یوں بھی وہاں کے رواج کے مطابق جو جوتے جوتیاں چلن میں ہیں اُن کی تاریخ ولادت اور اُن کی وضع قطع کا نہ تو ہمیں علم ہے اور نہ ہم

ان کے مزے اور ذائقے سے مستفید ہوئے ہیں۔ ہاں ہمیں اپنے پڑوسی ملک چین کے اُن قفلی جوتوں کی یاد بہت آتی ہے جن میں اہل چین اپنی کمسن لڑکیوں کو پہناتے تھے۔ ان لڑکیوں کو وہاں لعبتان چین کہا جاتا تھا اور ہمیں کسی نے بتایا تھا کہ لعبتان کی لفظی ترکیب گڑیوں کے لئے مستعمل ہے۔ قفلی جوتوں سے ہماری مراد وہ جوتے ہیں جو پیروں کو مناسب حد میں رکھتے ہیں اسی لئے اگر آپ کی نظر پڑے تو دیکھا ہوگا کہ چینی لڑکیوں کے پاؤں پیائش کے حساب سے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ چین میں لڑکیوں کا ننھا منا تو نہیں لیکن مختصر سائز نہ صرف مقبول ہے بلکہ اُس ملک میں آئین فطرت ہے۔ وہاں حسن کا معیار یہی بالشتیے پاؤں ہیں۔ کیا حسن شناس لوگ ہیں جو پیروں کو حسن و جمال کی بنیاد سمجھتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ وہاں ہر نوخیز لڑکی کے جوتے کا سائز صرف ۴ ہے اور شاید اسی باعث جب چینی لڑکیاں فن تیراکی کا مظاہرہ پیش کرتی ہیں تو وہ پوری کی پوری زیر آب رہتی ہیں لیکن ان کے خوبصورت پاؤں کا رُخ آسمان کی طرف ہوتا ہے۔ ہم ہندوستانی اس شق میں اہل چین سے کتنے مختلف ہیں۔ ہمارے یہاں یہ کہاوت بھی جوتوں کی طرح چلن میں ہے کہ سر بڑا سردار کا پاؤں بڑا گنوار کا۔ ہمارے یہاں کھڑاؤں کے بعد جو پاپوش وجود میں آئی وہ چپل تھی۔ ہمارے کفش سازوں نے جنھیں ہم موچی کہا کرتے تھے جلدی ہی سے اپنا کاروبار شروع کیا اور اسی میں نام کیا۔ جوتے تو بہت بعد میں منظر عام پر آئے۔ اب جوتوں کا یہ حال ہے کہ یہ خود تو زمین پر مقیم رہتے ہیں لیکن ان کی قیمتیں آسمان سے بیت بازی کے مقابلے منعقد کرتی ہیں۔ وہ تو آسمان کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ قیمتوں کو یعنی جوتوں کی قیمتوں کو مزید اوپر جانے کا راستہ نہیں ملتا ورنہ یہ جوتے ماننے والے تھے نہیں۔

جوتوں میں ہمارے پسندیدہ وہ ہیں جن کی وجہ سے عہد مغلیہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور وہ ہیں سلیم شاہی جوتے۔ مشہور تو یہ ہے کہ مغل بادشاہ اور مغل شاہزادے جو موجڑیاں پہنتے تھے اُن میں ہیرے جواہرات جڑے ہوئے ہوتے تھے۔ ہمیں ان کہانیوں سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ ہم تو سلیم شاہی جوتوں کی ملائمت اور پُرکاری کے قائل ہیں۔ انھیں سلیم شاہی جوتوں کے باعث جوتوں کی نوک کو شہرت حاصل ہے ورنہ ان سے پہلے جوتے اور نوک، دو متضاد اور متخالف چیزیں ہیں۔ سلیم

شاہی جوتے آج بھی سبک اور بے آواز ہیں لیکن اُن کا دبدبہ اور وقار حسب سابق برقرار ہے۔

جوتوں کو مقبول بنانے میں ہمارے تعلیمی اداروں کا بڑا دخل رہا ہے۔ جوتے اسکول یونیفارم کا جزلانیفک ہیں۔ خاص طور پر انگریزی میڈیم کے اسکولوں میں یہ تک دیکھا جاتا ہے کہ طالب علم کے جوتے پالش شدہ ہیں یا نہیں۔ کچھ صدر مدرس صاحبان ان جوتوں کو آئینے کی طرح چمکدار دیکھنا اور ان میں اپنی شکل دیکھتے پائے گئے ہیں۔ اپنی شکل وصورت بگاڑنے کو بھی معلم صاحبان، طالب علموں کے جوتوں کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ (لیکن ہمیں اس سے کچھ لینا دینا نہیں ہے)۔

ہمارے کھلاڑیوں نے بھی جوتوں کی ترویج واشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ ہندوستانی کھیلوں میں مثال کے طور پر کبڈی، کھوکھو وغیرہ میں جوتوں کا کوئی دخل نہیں لیکن کینوس کے جوتوں کے علاوہ ٹینس شوز، کرملاک شوز کا شہرہ چاردانگ عالم میں ہے۔ کرکٹ شوز کی بیرونی سمت تو کیلوں سے مزین ہوتی ہے۔ (کیلوں کو کیل کی جمع سمجھ کر پڑھیئے موز یعنی کیلے مت سمجھے گا)۔ جب ان جوتوں کی کوئی کیل ادھر اُدھر کھل جاتی یا اس کی مضبوطی میں ماشہ برابر فرق آجاتا ہے تو کھلاڑی دستانے اور موزے اتار کر اس کیل کو پیچیدار یعنی اسکروڈرائیور سے از سرنو نصب کرتا ہے۔ جب تک اس کا جوتا استحکام حاصل نہیں کر لیتا۔ کھیل رُکا اور تماشائی دم سادھے رہتے ہیں۔ کھیل کی روئیداد نشر کرنے والے معلن بھی مجبوراً اِدھر اُدھر کی ہانکنے لگتے ہیں لیکن اس سے ہمیں کیا لینا دینا ہے۔ بلے باز بہرحال دوسری ہی گیند پر آوٹ ہو جاتا ہے اور اسے جوتے ہی کی کارستانی سمجھتا ہے۔ ہمارے کرکٹ کھلاڑیوں میں سے اکثر کو اپنی خوش فہمی کا عارضہ لاحق ہے جو ہمارے ادیبوں اور شاعروں میں وبا کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ جوتوں کی ایک اور قسم رائج ہوتی ہے۔ یہ چرم سازی کی تجارت میں فروغ کا باعث ہے۔ یہ عام لوگوں سے اس لئے مختلف ہوتے ہیں کہ ان میں خام مال بکثرت استعمال ہوتا ہے۔ یہ جوتے پہنتے نہیں چڑھائے جاتے ہیں۔ یہ ایڑی پنڈلی نہیں بلکہ گھٹنوں کے قریب پہنچ کر دم لیتے ہیں۔ اس قسم کے بھاری بھرکم جوتے پہن کر بھی کچھ لوگ سڑکوں پر چلتے اور دل ہی دل میں خوش ہوتے ہیں۔ یہ لوگ صحیح معنوں میں چلے ہوئے لوگ ہوتے ہیں۔ ان جوتوں میں ایک ہی خوبی ہے کہ یہ کبھی چرائے نہیں گئے۔ سارق اُنھیں چرائے تو رکھے کہاں۔ سر پر تو رکھنے سے رہا۔ جوتوں کا

بڑے سے بڑا شوروم بھی ان جوتوں کا متحمل نہیں ہوتا۔ یہ نایاب جوتے کفش ساز ماہرین، بالا بالا ہی انھیں فروخت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

طویل مسافت کی دوڑوں کے مقابلوں میں حصہ لینے والے برق رفتار کھلاڑی عام طور پر دبلے ہوتے ہیں۔ یہ اپنے جوتوں ہی کی فکر میں دبلے ہوتے ہیں۔

بعض جوتے بولتے بہت ہیں۔ انھیں تیل پلانا پڑتا ہے۔ بعض جوتے کاٹتے ہیں۔ تنگ جوتے پہننے کے خسیس لوگوں کی یہی سزا ہے جو جوتے کاٹیں اُن کا کوئی علاج نہیں۔ ڈھیلے جوتوں کا علاج البتہ ممکن ہے۔ اب جوتوں کے تلے بھی الگ سے فروخت ہونے لگے ہیں۔ یہ تلے جوتوں کے اندر بچھائے جاتے ہیں۔ ضرورت کے مطابق دو چار تلے خرید لئے جائیں تو مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ ان دو چار تلوں کی وجہ سے اگر پاؤں بھاری ہو جائیں تو پروانہ کیجئے اور ہاں اپنا قد بڑھانے کے لئے کسی جمنانہ جانے اور کسی آہنی سلاخ سے لٹکنے کی ضرورت نہیں۔ اونچی ایڑی کا جوتا پہنئے اور کسی بھی قد آور شخص سے شانہ بہ شانہ چلنے کا لطف اٹھایئے۔

جوتے طبعاً اور عملاً مشکل کشا ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ہم اُن لوگوں کا ذکر نہیں کرنا چاہتے جو جوتوں کو اشیائے خوردنی سمجھتے ہیں اور یوں بھی ہم کو ان پُر خور لوگوں سے کیا لینا دینا ہے!!

☆

مجتبیٰ حسین بلند قد طنز مزاح نگار ہیں۔ انہوں نے منتظر زیدی کے جوتے کو مہلک ہتھیار قرار دیتے ہوئے لکھا ہے :

عراق کے صحافی منتظر زیدی کا جوتا پچھلے دو ہفتوں سے نہ صرف ساری دنیا میں چل رہا ہے بلکہ اس کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس کی پھنکار میں بھی روز بروز اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ دنیا بھر میں ایسا پائیدار اور مضبوط جوتا شاید ہی کسی شو کمپنی نے بنایا ہو، جو اگرچہ تلف کر دیا گیا ہے لیکن پھر بھی چلتا ہی چلا جا رہا ہے۔ یہ اتنا خود کفیل اور خود مکتفی بن چکا ہے کہ کوئی اسے پہنے یا نہ پہنے وہ اپنے آپ ہی چلتا اور برستا چلا جا رہا ہے۔ پندرہ دن پہلے جن منتظر زیدی نے اس جوتے کو صدر امریکہ جارج ڈبلیو بش پر ایک اضطراری کیفیت کے ساتھ پھینکا تھا تو ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ ایک تاریخی جوتا ہے

جو عام جوتوں سے سراسر مختلف ہے۔ بش پر پھینکے جانے والے ان دونوں جوتوں کی انفرادیت یا خوبی یہ تھی کہ دونوں ٹھیک نشانے پر پھینکے تو گئے تھے لیکن نشانے نے یعنی خود جارج ڈبلیو بش نے خوش قسمتی سے اچانک ڈ بک کر یا پینترا بدل کر انھیں نشانے پر بیٹھنے نہیں دیا۔ اگر دونوں جوتوں میں سے ایک جوتا بھی خدانخواستہ جارج بش کے لگ جاتا تو اس کی کوئی تاریخی اہمیت نہ ہوتی۔ اب رہتی دنیا تک یہ جوتے حسب ضرورت اور حسب موقع اپنے نشانے کی تلاش میں پینترے بدل بدل کر چلتے رہیں گے۔ یوں ایک علامت کے طور پر ان جوتوں کا دائمی سفر تاریخ میں ہمیشہ جاری رہے گا۔

ہم نے پندرہ دن پہلے ہی ان عہد ساز زیدی جوتوں کے بارے میں کچھ لکھنا چاہا تھا لیکن آپ جانتے ہیں کہ جب جوتوں کی بات چل نکلتی ہے تو کئی دنوں تک جوتیوں میں دال بھی ضرور بٹتی ہے۔ ہماری زبان کے محاوروں کی خوبی یہ ہے کہ بازار میں دال چاہے کتنی ہی مہنگی کیوں نہ ہو جائے وہ بڑی آسانی سے جوتوں میں بٹنا شروع ہو جاتی ہے۔ چاہتے تو ہم بھی اس جوتم پیزار یا جوتوں کی دوڑ میں شامل ہو کر اظہار خیال کر سکتے تھے۔ لیکن ہم غالب کے سخن فہم نہ سہی ان کے طرفدار تو ہیں۔ غالب نے کبھی وبائے عام میں مرنا پسند نہیں کیا اسی لئے ہم نے بھی اپنے آپ کو مصلحتاً ہی سہی اس وبائے عام سے دور رکھنا ہی ضروری جانا۔ یوں بھی اردو مزاح نگاری کے باوا آدم اکبر الہ آبادی نے بہت پہلے اپنے ایک شعر میں جوتے اور قلم کا ایک بھر پور تقابلی مطالعہ پیش کیا تھا۔ اکبر الہ آبادی کے زمانے میں جوتے بنانے کی ایک مشہور کمپنی ڈاسن کے نام سے قائم تھی جس کے جوتے اپنی وضع قطع، پائیداری اور سہولت بخشی کے اعتبار سے اس زمانے کے معاشرے میں بہت مقبول تھے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ یہ جوتے صرف سڑکوں پر چلتے تھے یا مشاعروں، عام جلسوں اور سیاسی تقاریب میں بھی ان کا چلن عام تھا۔ بہر حال اکبر الہ آبادی نے اس موضوع پر شعر کہا تھا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ منتظر زیدی خود ایک صحافی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ٹیلی ویژن صحافی ہیں۔ ٹیلی ویژن صحافی کا تعلق جتنا کیمرے سے ہوتا ہے اتنا ہی قلم سے بھی ہوتا ہے۔ اس صحافی نے جارج ڈبلیو بش پر اپنا جوتا پھینک کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ آج کے زمانہ میں جوتا بھی صحافت کا ایک اہم

اور موثر ذریعہ بن گیا ہے۔ اب صرف قلم کے سہارے صحافت نہیں چل سکتی بلکہ اس کے لئے ایک اچھے کیمرے کے علاوہ ایک پائیدار جوتا بھی درکار ہوتا ہے۔ بغداد میں جارج ڈبلیو بش کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس میں ہمیں قلم تو چلتا ہوا نہیں دکھائی دیا البتہ جوتا ہمیں قدم قدم پر چلتا ہوا دکھائی دیا بلکہ یہ جوتا اتنا چلا اتنا چلا کہ کئی دنوں تک چلتا ہی رہا، آج بھی چل رہا ہے۔ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ یہ جوتا اب ہمیں زبانی یاد ہو گیا ہے۔ ہم زندگی بھر پرورش لوح وقلم کرتے رہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس میں ہمارے ہاتھ بھی قلم ہوئے۔ منتظر زیدی نے جوتے کی اہمیت میں اتنا اضافہ کر دیا کہ یہ جوتا جارج ڈبلیو بش کے آٹھ سالہ دور صدارت کے تابوت میں آخری کیل کا درجہ اختیار کر گیا۔ اگرچہ منتظر زیدی ان دنوں عراق کی جیل میں ہیں لیکن جیل کے باہر ان کے جوتوں کو جو مقبولیت مل رہی ہے وہ حیرتناک ہے۔ پتہ چلا ہے کہ منتظر زیدی نے جارج ڈبلیو بش پر جو جوتا پھینکا تھا اسے بنانے والی کمپنی ترکی میں واقع ہے۔ اس کمپنی کا نام بیدان شو کمپنی ہے اور اس کے مالک کا نام رمضان بیدان ہے۔ بغداد کے عہد ساز واقعہ کے بعد دنیا بھر میں اس کمپنی کے جوتوں کی مانگ میں اضافہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ اب تک اس کمپنی کے پاس جوتوں کی تین لاکھ جوڑیوں کے آرڈر آ چکے ہیں۔ کمپنی اب اس جوتے کا نام ''بیدان'' کی بجائے ''ہائے ہائے بش'' رکھنا چاہتی ہے۔ لائق تحسین بات یہ ہے کہ اس جوتے کے آرڈر صرف مسلم ممالک سے نہیں آرہے ہیں بلکہ امریکہ اور برطانیہ کے بیشتر روشن خیال اور وسیع النظر افراد نے بھی اس جوتے کے آرڈر دیئے ہیں۔ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ یہ جوتے صرف پہننے کے کام آئیں گے یا انھیں خصوصی طور پر پھینکنے کے لئے بنایا جائے گا۔ تب تو جوتوں کی اصلیت، ماہیت اور غرض و غایت بھی تبدیل ہو جائے گی۔ جس طرح ہاتھی کے دانت دو طرح کے ہوتے ہیں یعنی کھانے کے اور، اور دکھانے کے اور۔ اسی طرح اب جوتے بھی دو طرح کے بنائے جائیں گے یعنی پہننے کے جوتے اور طرح کے اور پھینکنے کے جوتے مختلف وضع کے۔ بہت پہلے ہم نے کہیں پڑھا تھا کہ جاپانی مزدور ہڑتال کرنے کو بہت بُرا سمجھتے ہیں۔ مسائل کتنے ہی سنگین کیوں نہ ہوں کارخانے میں کام نہیں بند ہونے دیتے۔ جاپان میں جوتے بنانے والی ایک کمپنی کے مزدوروں کے مسائل بگڑنے لگے تو اُنھوں نے احتجاج کا ایک انوکھا طریقہ اختیار کیا۔ انھوں نے کارخانے میں کام تو بند

نہیں کیا البتہ ایک پاؤں کے جوتے یعنی سیدھے پاؤں کے جوتے بناتے چلے گئے ۔ جوتوں کی جوڑیاں تو نہیں بنیں البتہ کام ضرور جاری رہا۔ جب کارخانہ کے مالکوں نے مزدوروں کے مطالبات مان لئے تو مزدوروں نے فوراً دوسرے پاؤں یعنی بائیں پاؤں کے جوتے بنانے شروع کر دیئے۔ ہمارا خیال ہے کہ پھینکنے کے لئے بنائے جانے والے جوتوں کے سلسلے میں ایسا اہتمام ضروری نہیں ہے کہ وہ دونوں پاؤں کے جوتے جوڑی کی شکل میں پھینکے جائیں۔ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ جس ہستی پر یہ جوتے پھینکے جائیں وہ اس کے پاؤں میں بھی فٹ بیٹھیں۔ وہ کوئی بے شرم ہی ہوگا جو خود پر پھینکے جانے والے جوتوں کو پہننا پسند کرے گا۔ لہذا پھینکے جانے والے جوتوں کی ساخت کے بارے میں خصوصی توجہ دی جاسکتی ہے۔ ان جوتوں کا آرام دہ اور پائیدار ہونا بھی ضروری نہیں ہے تاہم ان میں ضرور رسائی کے خصوصی عنصر کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ جس پر انھیں پھینکا جائے اسے پتہ تو چلے کہ انھیں کیوں پھینکا گیا ہے اور پھینکنے والے کا کرب کتنا شدید ہے جس کا اندازہ وہ ضرب کی شدت سے لگا سکتا ہے۔

ہمیں اس وقت اپنی زندگی کے بعض محبوب جوتے بہت یاد آرہے ہیں۔ وسطانی جماعتوں میں ہمارے پاس ایک خوبصورت جوتا تھا جو ہمیں بے حد پسند تھا۔ اس کا تلا خراب ہو جاتا تھا تو ہم اسے بدلوا دیتے تھے اور جب اس کا اوپری حصہ خراب ہو جاتا تھا تو اس کے بدلنے کی باری آجاتی تھی۔ اصل جوتا تو کہیں غائب ہو گیا تھا البتہ ایک خیالی ہیولا سا رہ گیا تھا جس میں کبھی تلا چڑھایا جاتا تھا اور کبھی اوپری حصے کو بدلا جاتا تھا۔ ایک زمانہ میں اس کے تلے میں اتنا بڑا سوراخ پیدا ہو گیا تھا کہ اسے پہنتے ہی ہم میں زمین سے جڑے رہنے کا احساس دوبالا ہو جاتا تھا۔ اگر تلے کے نیچے سڑک پر پڑی ہوئی کسی کی کوئی چونّی یا اٹھنی آجاتی تو ہم کھڑے کھڑے یہ اندازہ لگا لیتے تھے کہ تلے کے نیچے پڑے ہوئے سکے کی مالیت کتنی ہے۔ اس جوتے کی خستہ حالی کا یہ عالم تھا کہ جب ہم اسے پہننے سے پہلے پاؤں میں موزے پہننے لگتے تھے تو ہمارے ہاسٹل کے ساتھیوں کا مشورہ یہ ہوتا تھا کہ ہم ان موزوں کو جوتے کے اندر نہیں بلکہ ان موزوں کو جوتوں کے اوپر سے چڑھالیں تا کہ نئے موزوں کے اندر ان پرانے جوتوں کی بدہیئتی ڈھکی چھپی رہے۔ یہ جوتا ہماری غربت کے دنوں کا رفیق تھا اسی لئے ہمیں

بہت عزیز بھی تھا مگر آج اس کی یاد آتی ہے تو خیال آتا ہے کہ ایسا جوتا بدنام زمانہ ہستیوں پر پھینکے جانے کے لئے موزوں ترین تھا۔ آخر میں ہم اپنے دل کی سچی بات بھی، جو جارج ڈبلیو بش کی حمایت میں جاتی ہے، اپنے قارئین کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں۔ چاہے کچھ بھی ہو جارج ڈبلیو بش دنیا کے طاقتور ترین حکمراں ہیں۔ ان کے ایک اشارے پر دنیا میں تہلکہ مچ جاتا ہے۔ اتنے بڑے حکمراں کی ایسی بے عزتی بھی اچھی نہیں لگتی۔ آپ تو جانتے ہیں کہ جارج ڈبلیو بش نے جب عراق پر ہولناک حملہ کیا تھا تو اس حملہ کا یہ جواز پیش کیا تھا کہ عراق میں صدام حسین نے ہولناک تباہی کے مہلک ہتھیار (Weapons of Mass Destruction) جمع کر رکھے ہیں۔ امریکہ کی سب سے مؤثر خفیہ ایجنسی سی آئی اے نے یہ اطلاع جارج ڈبلیو بش کو فراہم کی تھی۔ اسی اطلاع کی بنیاد پر جارج بش نے اپنا لاؤ لشکر لے کر عراق پر وہ بھیانک حملہ کیا تھا کہ بغداد پر منگولوں اور تاتاریوں کے حملے شرمسار ہو گئے۔ عراق کے چپہ چپہ پر ان مہلک ہتھیاروں کو تلاش کیا گیا اور ہر جگہ امریکی فوجوں کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر بش نظم و نسق کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ صدام حسین کے پاس عام تباہی کے مہلک ہتھیار موجود نہیں تھے اور یہ کہ سی آئی اے نے انھیں اس معاملہ میں غلط باور کرایا تھا۔ اب جبکہ بش کے دور اقتدار کے ختم ہونے میں صرف دو ہفتے رہ گئے ہیں قدرت پھر ایک بار بش پر مہربان ہو گئی ہے۔ کون کہتا ہے کہ عراق کے پاس تباہی کا مہلک ہتھیار نہیں تھا۔ منتظر زیدی کا جوتا ہی تو وہ اصل مہلک ہتھیار ہے جو امریکی فوجوں کی نظر میں نہیں آسکا تھا۔ اس جوتے کی ہلاکت خیزی کا وہ عالم ہے کہ یہ دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ چلتا رہے گا اور جارج ڈبلیو بش کی بربادی کے لئے عذاب جاریہ کی حیثیت اختیار کر لے گا۔ بالآخر امریکی فوجوں کو وہ مہلک ہتھیار مل گیا ہے جس کی تلاش میں وہ اتنی دور سے عراق آئے تھے۔!!

کسی نے اس سلسلے میں ایک لطیفہ گڑھا ہے :

جج : (صدر بش کو جوتے سے نشانہ بنانے والے صحافی منتظر الزیدی سے سوال کرتے ہوئے) تم نے دونوں کی توہین کیوں کی؟

منتظر الزیدی : (حیرت سے) دونوں کی؟؟

جج : ہاں!! دونوں کی؟

منتظر الزیدی : نہیں! جج صاحب!! آپ کو کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے دونوں کی توہین نہیں کی! میں نے مالکی کو کچھ نہیں کہا صرف بش پر جوتے برسائے۔

جج : بے وقوف میں ان دونوں کی بات نہیں کر رہا ہوں بلکہ ان دونوں جوتوں کی بات کر رہا ہوں جو تم نے بش پر پھینکے!!

☆

''گلستاں'' میں شیخ سعدی نے ایک حکایت لکھی ہے جسے یہاں نقل کرنا چاہتا ہوں تاکہ پڑھنے والے ''درس'' لے سکیں۔ یہ تابندہ نقش جوتے کے ہی تناظر میں ہے :

''میں زمانے کی گردش سے کبھی نہ گھبرایا اور نہ رنجیدہ خاطر ہوا۔ ایک بار ضرور تکلیف ہوئی جب میرے پاؤں میں جوتے نہیں رہے اور جوتا خریدنے کی میرے پاس گنجائش نہ تھی۔ اس عالمِ پریشانی میں میں کوفے کی جامع مسجد میں جانکلا۔ میں نے وہاں ایک آدمی کو دیکھا جس کے پیر ہی نہیں تھے۔ میں (جو جوتوں کے نہ ہونے پر خدا سے شکوہ سنج تھا) اپنے دونوں پاؤں کی سلامتی پر خدا کی اس عظیم نعمت کا شکریہ بجالایا اور جوتے کے نہ ہونے پر صبر کیا۔'' (حکایت نمبر۔۱۹)

☆

مرزا غالب کا ایک لطیفہ جوتے کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک دن مرزا غالب سے ملنے سردار سید مرزا آئے۔ جب وہ جانے لگے تو غالب خود شمع لے کر کھسکتے کھسکتے فرش کے کنارے تک آئے تاکہ سید صاحب اپنا جوتا روشنی میں دیکھ کر پہنیں۔ انہوں نے کہا ''قبلہ! آپ نے کیوں تکلیف فرمائی۔ میں جوتا خود ہی پہن لیتا۔''

مرزا غالب بولے ''میں آپ کا جوتا دکھانے کو شمع نہیں لایا بلکہ اس لئے لایا ہوں کہ کہیں آپ میرا جوتا نہ پہن لیں۔''!

☆

مہاتما گاندھی کا ایک واقعہ اردو داں میں بھی مشہور ہے جس کا تعلق جوتے سے ہے۔ گاندھی جی

ایک مرتبہ ریل میں سفر کر رہے تھے۔ کسی اسٹیشن پر اپنے ڈبے کے دروازے پر کھڑے تھے۔ ریل گاڑی چلنے لگی تو جھٹکے سے ان کے پیر کی چپل نیچے گر پڑی۔ تب تک گاڑی رفتار پکڑ چکی تھی۔ انہوں نے فوراً دوسرے پیر کی چپل بھی باہر پھینک دی۔ لوگوں نے حیرت سے وجہ پوچھی تو ان کا جواب تھا کہ جس کسی کو ایک چپل ملے گی وہ اس کے لئے بے کار ہوگی اور یہ جو میرے پاس رہ گئی ہے میرے لئے بیکار ہے۔ اسی لئے باہر پھینک دی کہ جس کو پہلی چپل ملے گی وہ دوسری ڈھونڈ لے گا۔''

☆

مجنوں گورکھپوری اور فراق گورکھپوری ایک بے تکلف محفل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مجنوں نے پوچھا ''چٹکنا اور چٹخنا'' میں کس کا استعمال کہاں کرنا مناسب ہے۔''

فراق نے ہنستے ہوئے کہا ''چٹکتی ہے کلی۔ اور جوتیاں چٹخائی جاتی ہیں۔!''

☆

جوتا جمع کرنے کا عالمی ریکارڈ بھی ہے۔ امریکہ کے جارڈن کا نام گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں شامل ہے۔ وہ خود بتاتا ہے:

''یقیناً یہ میرے لئے بہت خوشی کی بات ہے کیونکہ میں کوئی ایسا کام کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا جس سے میری واہ واہ ہو جائے۔ مگر مجھے کوئی ترکیب نہیں سوجھ رہی تھی۔ پھر میرے ایک دوست نے بتایا کہ تم دنیا کے مہنگے ترین جوتے پہنتے ہو۔ کیوں نہ تم ان جوتوں کو استعمال کے بعد اپنے اسٹور میں جمع کرنا شروع کر دو۔ میرے پاس کئی برس سے جوتوں کے ڈھیر رکھے ہوئے تھے۔ میں نے مزید جوتے خریدنا شروع کر دیئے اور دس برس میں یہ تعداد ڈھائی ہزار سے بھی تجاوز کر گئی۔ سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ تمام جوتے ایک کمپنی کے ہیں۔ مگر ان کے ڈیزائن اور ماڈل نمبر تبدیل ہیں۔ میرے خیال میں یہ دنیا کا مہنگا ترین کارنامہ ہے۔ کیونکہ جوتوں کی ایک جوڑ 300 سے 1500 ڈالر میں فروخت ہوتی ہے۔ اور کوئی بھی ایسا خطرہ مول نہیں لیتا کہ وہ ان جوتوں کو خرید کر ریکارڈ قائم کرے۔ میں نے اسی لئے یہ ریکارڈ بنانے کا عزم کیا تھا۔ کوئی بھی اس طرح کا ریکارڈ بنانے سے سو بار سوچے گا ضرور۔ اور ایسی ہی مجھے کامیابی ملی۔ ڈھائی ہزار سے زائد جوتے اس وقت میرے اسٹور

میں موجود ہیں۔ میں امریکہ سے باہر کہیں بھی جاتا ہوں اپنے لئے نئے جوتے ضرور خریدتا ہوں۔ کاروباری سلسلے میں میں جرمنی، فرانس، برطانیہ اور دوسرے ممالک جاتا ہوں۔ میری پہلی ترجیح نائیک کمپنی کے جوتے ہوتے ہیں۔ کیونکہ میں ان کی تعداد کو دس ہزار تک لے جانا چاہتا ہوں۔ جبکہ ایسا نہیں ہے کہ میں نئے جوتے یہاں لاکر رکھتا ہوں بلکہ ان جوتوں کو استعمال کے بعد یہاں رکھتا ہوں۔''

☆

انعام الرحمٰن نے جوتوں سے انسان کا تعلق جوڑا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ :

''سو جوتے سو پیاز'' والا محاورہ تو یقیناً آپ نے سن رکھا ہوگا۔ یہی محاورہ سن کر ہمیں خیال آیا کہ ہماری زندگی میں جوتوں کا کیا عمل دخل ہے۔ اس سلسلے میں عملی حصہ تو خطرناک ہی ہے لیکن دخل بھی بہت زیادہ نمایاں ہے۔ ویسے ایک اوسط عمر شخص زندگی میں جوتوں کا ایک سینکڑا پہن کر استعمال کر سکتا ہے لیکن جو شخص یہ حد پوری کرلے وہ یقیناً آسودہ حال ہوگا۔ جوتے میں تین اشیاء اہم ہیں اوپری حصہ، تلا اور ایڑھی۔ ان میں سے پہلی دو اشیاء مرد حضرات کے لئے اہمیت رکھتی ہے کیونکہ موجود معاشرتی صورتحال میں ایک عام شخص بغیر سفارش، رشوت اور جوتے چٹخائے نہ تو نوکری حاصل کر سکتا ہے اور نہ ہی یوٹیلیٹی اسٹورس سے گھی۔ دوسری طرف ایڑھی صنف نازک کی نظر میں انتہائی اہم شئے ہے کیونکہ اس سے فوری ہتھیار کے استعمال کے دو طریقے ہیں۔ ایک براہ راست استعمال۔ اس کے ذریعے بس اسٹاپ پر ''ہیرو'' کی پٹائی کی جاسکتی ہے اور بالواسطہ اس طرح کہ کسی تقریب میں شرکت کے لئے ایڑھی چوٹی کا زور لگا کر تیار ہو۔ ایک مکمل جوتا خواتین کی نظر میں صرف ایک ہی موقع پر خصوصی توجہ کا مرکز بنتا ہے جبکہ وہ کسی نئے دولہا کا ہو اور جب دولہا پہلی مرتبہ سسرال آیا ہو تب یہ جوتا چوری کرلیا جاتا ہے۔ لیکن یہ چوری سینہ زوری والا معاملہ ہوتا ہے۔ کیونکہ بعد میں زرتاوان وصول کر کے واپس کر دیا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ حرکت دولہا کی سوئی ہوئی خودداری پر ضرب لگانے کے لئے ہو کہ کاش! دولہا میاں اپنی ذاتی شادی میں تو کسی دوسرے یعنی سسرال کے دیئے گئے کپڑوں جوتوں کے بجائے اپنے پیسوں سے خرید لیتے، کیا خبر کہ آنے والے وقت میں یہ رسم جوتا چھپائی سے

ترقی کرتی ہوئی کپڑوں تک جا پہنچے۔

درحقیقت ایک زمانے تک ہماری عقل شریف میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ عید یا جمعہ کی نماز میں بزرگ پرانے جوتے پہن کر جانا کیوں مسنون قرار دیتے ہیں۔ اور جب مسجد سے ننگے پیر گھر کا رخ کرنا پڑا تو بھی پہلی مرتبہ تو ہم یہی سمجھے تھے کہ شاید کوئی تبرکا لے گیا۔ جوتے ایک زمانے تک صرف پاؤں میں پہننے کی شئے سمجھے جاتے تھے جس سے پیروں کی حفاظت مقصود ہوتی تھی۔ لیکن جب زمانے کا چلن بدلا اور اس کا رخ لوگوں کی زندگیوں پر پڑا تو ہمیں مختلف لوگوں۔ کے انٹرویو سے یہ بات پتہ چلی ہے کہ بڑے لوگ کسی شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے سب سے پہلے جوتوں کا معائنہ کرتے ہیں۔ تو پرانے اور گندے جوتے ہماری نظروں میں بھی کھٹکنے لگے۔ یقیناً دوسرے حضرات اس اہم بات سے پہلے باخبر ہیں۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر کسی منچلے نے انسانوں کی ایک بستی کا نام بھی پاپوش نگر رکھ دیا۔

جوتے کسی ناکام شخص کی زندگی سے بڑی گہری وابستگی رکھتے ہیں۔ مثلاً جب کوئی نکما طالب علم کسی امتحان میں بار بار فیل ہو کر کسی بزرگ کا خاندانی ریکارڈ توڑنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے جوتے کے ہار پہنائے جاتے ہیں اور یہی سلوک پکڑے جانے والے چور کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ کسی طرح کسی جھگڑے کے اختتام پر فاتح بھاگنے والوں کے جوتے ان پر پھینک کر مزید مارنے کی حسرت پوری کرتا ہے، اس مسئلہ کے حل کے لئے جوتے بنانے والی کمپنیوں نے بھاگنے کے لئے خصوصی جوتے تیار کرنے شروع کر دیئے ہیں جنہیں جوگرز کہا جاتا ہے۔ اس کے تسمے اتنے لمبے ہوتے ہیں کہ کمر بند نہ ملنے کی صورت میں ان تسموں کو فوری متبادل کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ انسان کو نہ تو اس دنیا میں آنے کے لئے جوتوں کی ضرورت ہے اور نہ ہی جانے کے لئے لیکن اس مختصر زندگی میں انسان جتنے بھی جوتے حاصل کرتا ہے وہ سب اس کے کردار اور اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

ایک اطلاع کے مطابق برطانیہ میں راستہ پہچاننے والے جوتے تیار کئے گئے ہیں۔

یعنی برطانوی ماہرین نے بیلوٹوتھ ٹیکنالوجی، گلوبل پوزیشننگ سسٹم اور وائبریٹرز سے مزین

راستہ پہچاننے والے جوتے تیار کر لئے ہیں، ماہرین کا کہنا ہے کہ بوڑھے افراد، بچوں اور لڑکیوں کے لئے زبردست ایجاد کہلائے جانے والے جوتے میں جب کوئی راستہ فیڈ کر دئے جاتے ہیں تو یہ اپنے پہننے والوں کی رہنمائی کرتا ہے، اگر مسافر کسی وجہ سے یا بھول جانے کے سبب راستے سے ہٹ جائے تو اس میں نصب جی پی ایس سسٹم راہ بھٹکنے کا نوٹس لیکر مسافر کو فوراً موبائل فون کی مدد سے آگاہ کرتا ہے۔ ''راہنمائی'' کے اس کام کے لئے بلیوٹوتھ ٹیکنالوجی کی مدد سے جوتے میں سے نکلنے والے سینیرز اس فرد کے موبائل فون تک پیغام ارسال کر کے بتاتے ہیں کہ وہ غلط راستے پر جا رہا ہے، جب کہ اس پیغام سے قبل ہی جوتے میں لگا نظام خصوصی طور پر نصب کئے جانے والے وائبریٹ کی تھرتھراہٹ سے مسافر کو آگاہ کر دیتا ہے کہ وہ غلط راستہ اختیار کر رہا ہے، جس پر مسافر اپنے موبائل میں پیغام دیکھ کر غلط راستہ ترک کر کے درست راہ کی جانب آ جاتا ہے۔

..........☆..........

مسعود احمد برکاتی نے ایک جوتے کی فریاد اس طرح بیان کی ہے :

میں جوتا ہوں۔ جی ہاں، وہی جوتا جو ہر وقت آپ کے پیروں کے نیچے رہتا ہے۔ کہنے کو کتنا قریب ہوں، مگر آپ سے بہت دور ہوں۔ کوئی میری نہیں سنتا۔ کوئی مجھے اچھے نام سے یاد نہیں کرتا۔ کہتے ہیں نام میں کیا رکھا ہے مگر جب اس نام کو ہمیشہ بُری مثال کے لئے، گالی کے لئے، طعنے کے لئے استعمال کیا جائے تو پھر آپ کا یہ کہنا کہ نام میں کیا رکھا ہے، کب صحیح ہوا! ویسے میرے اور بھی کئی نام ہیں۔ مجھے جوتی بھی کہتے ہیں۔ مجھے آج تک نہیں معلوم ہوا کہ جوتا اور جوتی میں کیا فرق ہے۔ آپ لوگ مجھے کبھی مرد سمجھتے ہیں اور کبھی عورت۔ اگر یہ ہوتا کہ مرد جب پہنیں تو میں جوتا کہلاؤں اور عورتیں اپنے پیروں کی زینت بنائیں تو مجھے جوتی کہیں، تو یہ بھی کوئی بات ہوتی، مگر آپ نے یہ امتیاز بھی نہیں رکھا۔ جوتی کے علاوہ مجھے پاپوش بھی کہتے ہیں۔ بعض شاعروں کو پاپوش زیادہ پسند ہے :

جان جائے گی اُن کی جائے گی
میری پاپوش بھی نہ آئے گی

میرا ایک اور نام ہے کفش۔ مولانا الطاف حسین حالی نے کہا ہے :

کمالِ کفش دوزی علم افلاطون سے بہتر ہے

حالی صاحب تو اگلے وقتوں کے لوگوں میں تھے، اس لئے انہوں نے اپنی مُسدّس میں قوم کی کاہلی اور بے عملی دور کرنے اور ہنر اور کمال کی قدر بڑھانے کے لئے کہہ دیا کہ جوتے سینے کے ہنر میں بھی اگر آدمی کمال پیدا کرے تو یہ اچھی بات ہے۔ گویا ایک ماہر موچی بھی بے عمل عالم سے اچھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آج کا کوئی شاعر، جوش میں بھی اور جوش دلانے کے لئے بھی ایسی بات نہیں کہے گا۔

خدا حالی کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

بات یہ بھی ہے کہ جناب حالی شاعر ہی نہیں عالم بھی تھے۔ ان کی قرآن پر بھی نظر تھی اور تاریخ کا مطالعہ بھی انھوں نے خوب کر رکھا تھا۔ ان کو معلوم ہوگا کہ جب حضرت موسیٰ کوہ طور پر گئے تو اللہ میاں نے اُن سے فرمایا:

فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى طٰہٰ، آیت ۱۲

ترجمہ: تم اس جگہ جوتے اُتارو۔ اب تم طویٰ کی مقدس وادی میں ہو۔

گویا طویٰ کی مقدس وادی شروع ہونے تک تو مجھے حضرت موسیٰ کے پاؤں میں ہونے کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ ایک بات اور آپ کی توجہ چاہتی ہے۔ قرآن کی اس آیت میں میرے لئے نعل کا نام استعمال ہوا ہے۔ پہلے عربی میں مجھے نعل ہی کہتے تھے۔ اب حِذاء کہتے ہیں۔

بہر حال آپ مجھے پاپوش کہیں، کفش کہیں، نعل کہیں، شُو کہیں یا کچھ اور، رہوں گا میں آپ کی نظروں میں پیر کی جوتی ہی اور جب کسی چیز کو حد سے زیادہ حقیر، ذلیل کرنا ہوگا، آپ اس کو مجھ ہی سے تشبیہہ دیں گے۔

زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ میری بہت سی قسمیں ہوگئی ہیں۔ بُوٹ، شو، گرگابی، ملتانی، ناگرا، سلیم شاہی، مکیشن، سینڈل، چپل، سلیپر، کھڑاؤں اور آج کل تو بہت سے اور بھی نام چل گئے ہیں۔

آپ کو تو شاید معلوم نہ ہوگا، ڈاسن جوتے بنانے، بیچنے والی ایک بہت بڑی کمپنی ہوا کرتی تھی۔ اس کے جوتے بہت مشہور تھے۔ لوگ بڑے شوق اور فخر سے پہنتے تھے۔ اکبر نے علم کی ناقدری کی

طرف اشارہ کیا ہے اور میرے نام سے ایک محاورہ بھی استعمال کیا ہے کہ جوتا چل گیا۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے اس کا مطلب کہ آپس میں لڑائی ہونے لگی، جیسی اکثر آج کل لیڈروں میں ہوتی ہے یا جلسے جلوسوں میں ہوتا ہے کہ مار کٹائی ہونے لگتی ہے۔ ہر شخص دوسرے کو برائی دیتا ہے۔ بات بڑھ جاتی ہے۔ لیڈر تو مزے سے اپنے اپنے گھروں میں یا دفتروں میں بیٹھے رہتے ہیں، بلکہ ایک دوسرے کے گھر دعوتیں اڑاتے ہیں، مگر اُن کے حامی اور ماننے والے آپس میں لڑنے جھگڑنے لگتے ہیں۔ خوب مار پیٹ ہوتی ہے۔ اسی کو جوتم پیزار ہونا کہتے ہیں۔ میرا ایک نام پیزار بھی ہے۔

اب اگر ملک میں مضمون نہ پھیلے، یعنی لوگوں میں پڑھنے لکھنے کا شوق نہ ہو تو بھلا بتائیے، اس میں میرا کیا قصور ہے۔ کیا میں ان کو روکتا یا منع کرتا ہوں۔ میں تو الٹی اُن کی مدد ہی کرتا ہوں۔ جو بچّے پڑھنے جاتے ہیں وہ مجھے ہی تو پہن کر جاتے ہیں۔ میں اُن کے پیروں کی حفاظت کرتا ہوں۔

میں اسکول کے بچوں کے پیروں کو ہی تکلیف سے نہیں بچاتا، بلکہ بڑے بڑے لوگوں کے پیروں میں پڑ کر ان کو آگے لے جاتا ہوں۔ ان کو اتنی اونچائی پر پہنچا دیتا ہوں کہ لوگ اُن کی جوتیاں اُٹھانا اپنے لئے قابلِ فخر سمجھتے ہیں، اُن کی جوتیاں سر پر رکھنا عزت کا ذریعہ جانتے ہیں۔ لوگ اُن سے کہتے ہیں کہ آپ کی جوتیاں سیدھی کرنا ہمارے لئے باعثِ عزت ہے۔

آپ کہیں گے تو سہی کہ اپنی تعریف آپ کر رہا ہوں لیکن اپنا ایک اور کارنامہ ضرور گنواؤں گا۔ وقت کے ساتھ ساتھ مجھ میں بھی بہت سی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ پہلے زمانے میں عورتیں سپاٹ جوتیاں پہنتی تھیں، یعنی جوتوں کی وضع تو عورت مرد سب کے لئے ایک ہی ہوتی تھی مگر عورتوں کے لئے اپنی جوتیوں کو بھی اس طرح دبانا ضروری تھا جس طرح خود اپنے آپ کو دبا کر رکھنا۔ چناں چہ اپنے جوتوں کی ایڑھیاں بٹھا لیتی تھیں، مگر اب عورتوں نے جس طرح خود سر اُٹھایا ہے اسی طرح اپنی جوتیوں کو بھی اونچا کر لیا ہے۔ اب وہ اونچی ایڑھی کی جوتیاں پہنتی ہیں جس کو آج کی زبان میں ''ہائی ہیل'' کہتے ہیں۔ چار چار انچ اونچی ایڑھی ہونے لگی ہے اب زنان چپلوں کی۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج کی عورتیں بھی قد آور معلوم ہونے لگی ہیں اور مرد کی برابری کا دعوا کرنے لگی ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کوئی بیگم صاحبہ کسی محفل میں ہائی ہیل پہنے آتی ہیں تو لوگ اُن کے منھ کے بجائے ان کی ایڑیاں دیکھ کر خود آپس

میں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگتے ہیں۔ تو دیکھا آپ نے ، میں بدلتے ہوئے حالات اور نئے خیالات کا بھی ساتھ دے رہا ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ مجھے اس کا کچھ صلا بھی ملا ہے اور اب میری قدر پہلے سے زیادہ ہونے لگی ہے۔ پہلے میری ایک جوڑی بہت ہوتی تھی ، اب آپ لوگ کئی کئی جوڑیاں رکھتے ہیں، لیکن میری شکایت اپنی جگہ ہے کہ میرا ذکر پھر بھی اچھی طرح نہیں ہوتا اور آپ نے ، بلکہ آپ کے بزرگوں نے بہت سے محاورے بنا رکھے ہیں جن میں وہ میرا نام استعمال کرتے ہیں اور اپنی بات کہنے کے لئے ان محاوروں کا سہارا لیتے ہیں۔ میں غریب مفت میں بدنام ہوتا ہوں اور مجھے ہی طعنہ دیے جاتے ہیں۔ بتائیے یہ مضمون جس میں ایک مہرباں نے میرے جذبات اور احساسات کو زبان دی ہے اور میری فریاد آپ تک پہنچا رہے ہیں اگر لوگ نہ پڑھیں تو اس میں کس کا قصور ہے۔ میں تو خدا سے دعا کرتا ہوں کہ ملک میں علم پھیلے اور جوتا نہ چلے۔ جوتا چلنے سے تو مجھے ہی تکلیف ہوتی ہے۔ جس کے جوتا پڑتا ہے اسی کے درد نہیں ہوتا، مجھے بھی چوٹ لگتی ہے اور پھر میں ٹوٹ بھی جاتا ہوں اور مجھے وہ موچی کے پاس پہنچا دیتے ہیں جو بڑی بے دردی سے میری مرمت کرتا ہے۔ وہ بھی بے چارہ کیا کرے، موچی ہی جو ٹھہرا، جسے لوگ چمار بھی کہہ دیتے ہیں، مگر ذرا ٹھہریے۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب ترقی کا دور ہے۔ ہر چیز صنعت بن گئی ہے۔ جوتے بنانے کی صنعت نے بھی بڑی ترقی کی ہے۔ اب یہ کوئی حقیر کام نہیں رہا، لوگ جوتے بنا بنا کر صنعت کار بن جاتے ہیں، امیر ہو جاتے ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح لیڈر جوتا چلوا کر مقبول اور ہر دل عزیز ہو جاتے ہیں اور وزیری کے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ ان صنعت کاروں نے ہماری قدر بھی بہت بڑھا دی ہے۔ نئے نئے ڈیزائن نکالتے ہیں اور بڑے سلیقے سے ڈبوں میں سجا کر رکھتے ہیں۔ جب قیمت بڑھانی ہوتی ہے تو ایک نیا ڈیزائن نکال دیتے ہیں۔ گاہک بے چارہ جب دُکان پر جا کر دام پوچھتا ہے تو اس کا منہ لٹک جاتا ہے، بالکل میری طرح۔ مگر کیا کرے اس کو ہر حال میں جوتا خریدنا ہے، وہ ٹوپی لینے تو نہیں آیا۔ یہ ٹوپی کا زمانہ نہیں، جوتے کی دنیا ہے۔ غریب سر جھکا کر جوتا پہن لیتا ہے۔

جب آپ مسجد میں جاتے ہیں تو وہاں بھی مجھے دروازے پر چھوڑ کر نہیں جاتے بلکہ ہاتھ میں لے کر مسجد کے اندر لے جاتے ہیں اور تلاش کر کے محفوظ جگہ پر رکھتے ہیں، کبھی صف کے آگے۔ کیا

بھروسہ کوئی ہاتھ کی صفائی دکھا دے اور آپ منہ دیکھتے رہ جائیں۔ مسجد عبادت کی جگہ ہے، مگر شاید بعض لوگ بھول جاتے ہیں اور وہاں 'جوتی چھپائی' کی رسم ادا کرنے لگتے ہیں، حالانکہ دولہا کے جوتے چھپا کر نیگ لینا تو صرف سالیوں کا حق ہے۔

میں تو آپ کی خدمت کرتا ہوں۔ آپ کی عزت بڑھاتا ہوں۔ آڑے وقت آپ کے کام آتا ہوں۔ آپ کی زبان کو نئے نئے محاورے دیتا ہوں۔ آپ کو آرام پہنچاتا ہوں۔ آپ کو صحت مند رکھتا ہوں۔ آپ کی دولت بڑھاتا ہوں، مگر آپ کا سلوک میرے ساتھ کیا ہے، آپ خود ہی غور کر لیجئے۔ کیا آپ اپنے ہر خادم اور دوست کے ساتھ یہی سلوک کرتے ہیں؟ اس سے تو بہتر ہے آپ میرے جوتے مار لیجئے۔ خیر اب میں اپنی آہ و فریاد ختم کرتا ہوں، ورنہ

آپ کے کوچے میں دشمن رات دن

جوتیاں پھرتے ہیں چٹخاتے ہوئے

منتظر زیدی نے جب بش پر جوتے پھینک مارے تو دنیا بھر کے ادب میں بھونچال آ گیا۔ ہر زبان میں اس کی اس جرأت کی ستائش کی گئی اور جوتے کے جیسے دن پھر گئے۔ اردو کے شاعروں اور ادیبوں نے بھی جوتے کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس سے معاشی اور معاشرتی حیثیت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی گئی۔ اور اس موضوع پر اتنا کچھ لکھا گیا جیسے جدید تہذیب میں انسان سے زیادہ قیمتی جوتے ہوں۔ منتظر زیدی نے صدر بش پر جوتے پھینکنے کی وجہ اس طرح بیان کی ہے:

"میں آزاد ہوں لیکن میرا ملک ابھی بھی جنگ میں مبتلا ہے۔ کافی بحث رہی اس شخص کے بارے میں۔ اس کے کارنامے کے بارے میں، اس ہیرو کے بارے میں اور اس کی بہادرانہ حرکت کے بارے میں لیکن میں محض اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں کہ اس طرح کے کام کے لئے اس ناانصافی نے مجھے مجبور کیا جسے میری عوام ہر روز جھیلتی آ رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ کس طرح ایک حملہ آور فوج اپنے بوٹوں تلے میرے دیش کی زمین کو روندتے ہوئے ہر روز ہمیں ذلیل کر رہی تھی۔

حال کے برس میں دس لاکھ سے بھی زیادہ لوگوں نے حملہ آور فوج کی گولیاں کھائیں اور شہید ہوئے۔ عراق میں آج پچاس لاکھ سے بھی زیادہ بچے یتیم ہیں۔ دس لاکھ عورتیں بیوہ ہو چکی ہیں اور

لاکھوں لوگ اپنے جسم سے معذور، کتنے لوگ بے گھر ہو گئے اس کا کوئی حساب ہی نہیں ہے۔

ہم ایک ایسا ملک ہوا کرتے تھے جہاں عرب لوگوں کے ساتھ ترکمان اور کرد، ایسیرین اور سیدیان بھی مل جل کر اپنی روزی روٹی کا انتظام کرتے تھے، جہاں شیعہ اور سنی ایک ساتھ قطار میں کھڑے ہو کر نماز ادا کرتے تھے، جہاں مسلمان عیسائیوں کے ساتھ مل کر عیسیٰ مسیح کی پیدائش کے دن مناتے تھے۔ ایسا ہم نے ان حالات میں بھی کیا، جب دس سال سے زیادہ عرصے تک اقتصادی پابندی کی وجہ سے ہم بھوک کی مار جھیل رہے تھے۔ لیکن حملے نے بھائی کو بھائی سے اور پڑوسی کو پڑوسی سے جدا کر دیا۔ اس نے ہمارے گھروں کو موت کے منظر میں تبدیل کر دیا۔

میں کوئی ہیرو نہیں ہوں، لیکن میرا ایک نظریہ ہے۔ میری ایک سوچ ہے۔ جب میں اپنے ملک کو بے آبرو ہوتے دیکھتا تھا، بغداد کو جلاتے ہوئے دیکھتا تھا اور اپنے لوگوں کو قتل کیے جاتے دیکھتا تھا تو مجھے ذلالت کا احساس ہوتا تھا، درد سے بھری ہزاروں تصویریں میرے دماغ میں ناچتی رہتی تھیں اور ایک مڈبھیڑ کی طرف بڑھنے کے لئے اکساتی رہتی تھی۔ مثلاً ابو غریب کے جیل، فلوجہ، نجف، ہادیہ، صدر سیٹی، بصرہ، دیالہ، موصل، تلا فار کے قتل عام اور ہمارے مجبور و مقہور ملک کی زمین کا ہر خطہ اپنی اس جلتی ہوئی زمین کے ایک طرف سے دوسری طرف کا میں نے سفر کیا اور لوگوں کے درد کو محسوس کیا، اپنے کانوں سے یتیم بچوں کی چیخ سنی، مسلسل شرم اور بے عزتی کے بوجھ سے دباؤ محسوس کرتا رہا کیونکہ میں ان کے لئے کچھ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔

ہر روز کے حادثے کی رپورٹنگ کرتے وقت جب میں بربادی کے شکار عراقی مکانوں کے ملبوں سے باہر آتا تھا یا اپنے کپڑوں پر پڑے خون کے دھبوں کو دیکھتا تھا، میرے دانت خود بھینچ جاتے تھے اور میں ان مارے گئے لوگوں کی طرف سے بدلہ لینے کی قسمیں کھاتا تھا۔

ایک موقع مجھے ملا اور میں نے اس کا فائدہ اٹھایا۔ میں نے چاہا کہ اپنی اس حرکت کے ذریعہ میں معصوم لوگوں کے بہے خون کے ہر ایک قطرے کا جواب لے سکوں، میں درد میں ڈوبی ہر ماں کی چیخ کا ہر یتیم کی گھٹن بھری آواز کا، عصمت کی شکار ہر عورت کی بے عزتی کا اور یتیم بچوں کے آنسوؤں کی ہر بوند کا جواب لے سکوں۔

جن لوگوں نے اس حادثہ کے لئے میرا مذاق اڑایا ان سے میرا سوال ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں نے جس جوتے کو پھینکا اس نے کتنے ٹوٹے ہوئے گھروں کے اندر داخلہ لیا؟ اس نے کتنی بار معصوم زندگیوں کے خون کے قطروں کو چھوا؟ ممکن ہے کہ جب سارے راستے بند ہو گئے ہوں تب یہ جوتا ہی ایک معقول جواب ہو۔

جب میں نے اس مجرم جارج بش کے چہرے پر جوتا پھینکا تو میں اس کے جھوٹ، اس کی مکاری، میرے ملک پر قبضہ کرنے کی اس کی حرکت اور میرے لوگوں کے قتل عام کے تئیں میں پوری شدت کے ساتھ اپنی نفرت ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اسے بتا سکوں کہ میرے ملک کی دولت کو لوٹنے اور میرے ملک کو برباد کرنے سے تم نے میرے اندر کس طرح کی نفرت پیدا کی ہے۔

اگر میری اس حرکت سے صحافت کو کوئی نقصان ہوا ہے، میری اس حرکت سے میرے پیشے سے جڑے لوگوں کو کسی طرح کی شرمندگی جھیلنی پڑی ہے تو اس کے لئے میں ان سے معافی چاہتا ہوں۔ میں ایک بار پھر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جو کچھ میں نے کیا اس کا مقصد زندگی کے احساس سے بھرے ایک شہری کے جذبات کو سامنے لانا تھا جو ہر روز اپنے وطن کو ذلیل ہوتے دیکھ رہا تھا۔

میں نے جو کچھ کیا، اس لئے نہیں کیا کہ میرا نام تاریخ میں کہیں درج ہو جائے۔ میں نے اس لئے کیا کہ میں اپنے ملک کی حفاظت کے لئے کچھ کر سکوں۔"!

..................☆..................

اس پس منظر میں فرد کی ذات کو پردۂ خفا میں نہیں رکھا جا سکتا۔ ایسے دیدہ آزمودہ افراد سے ہی کاروبار حیات چلتا ہے اور رنگ و آہنگ کا مینار کھڑا ہوتا ہے۔ ندا فاضلی اس کی تلاش میں دور تک جاتے ہیں، جس سے جوتے کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

انسان اور زمینی رشتے کے بدلتے ادوار کی تاریخ کا بیانیہ ہے۔ سردی سے بچنے کے لئے روئی، اون اور جانوروں کی کھالیں وجود میں آئیں۔ جب اللہ کی جنت میں آدم اور حوا نے شیطان کے بہکانے سے شجر ممنوعہ کا پھل کھایا اور پھر جب ایک دوسرے کو برہنہ پایا تو پہلے درختوں کے پتوں سے اس برہنگی کو چھپایا۔ پھر جب زمین کو بسایا تو طرح طرح سے شرم و حیا کا شعور جگایا۔ پھر گرمی آئی۔

سورج کی حرارت نے سر کے اوپر چھپر اٹھایا، برسات نے پانی سے بچنے کا گُر سکھایا۔ بھوک نے کبھی جڑی بوٹیوں کو کھایا، کبھی جانوروں کو بھوجن بنایا۔ زمین کے کنکر پتھر نے جب پیروں کی نرم جلد کو ستایا تو آدم زاد نے اس تکلیف سے بچنے کے لئے کبھی لکڑی سے کھڑاون بنائی اور کبھی جانور کی کھال سے پیروں کو کنکر پتھر کے زخموں اور دھوپ کی تیزی سے تلووں کو آرام پہنچایا۔ وقت کے ساتھ آدمی کی ضرورتوں نے دریا، پہاڑ، درختوں وغیرہ کو توڑ جوڑ کر سنسار سجایا۔ اس سنسار کی تہذیبی تعمیر میں جوتے نے بھی ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی کئی نشانیوں میں سے ایک کے جوتے ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ہاتھی آدمی سے کئی گنا لمبا چوڑا ہے لیکن اسے کبھی جوتے کی ضرورت نہیں پڑتی، شیر کو جنگل کا راجہ کہا جاتا ہے پورا جنگل اس کے اختیار میں ہوتا ہے لیکن وہ بھی آدمی اور عورت کی طرح نہ کسی چیز سے اپنے ننگے پن کو ڈھانپتا ہے، نہ بھوجن کے لئے شکار کی راہوں کو جوتوں سے ناپتا ہے۔ چڑیاں بھی اپنے پنجوں سے پھدکتی پھرتی ہیں۔ اور بزرگ مصور مقبول فدا حسین کے پیر بھی اس انسانی ایجاد سے آزاد ہیں۔ وہ انسانوں کی طرح داڑھی ترشواتے ہیں، اپنے ڈیزائن کے کپڑے بھی سلواتے ہیں، مسلمان ہوتے ہوئے کبھی حسینی رامائن بناتے ہیں، کبھی بھارت ماتا کو آدی باسی کی طرح بے لباس دکھاتے ہیں، پھر بھی سپریم کورٹ سے معافی پاتے ہیں۔ لیکن جوتا کبھی ان کی بے توجہی سے ناراض نہیں ہوا۔ لوگوں نے اپنے جوان اور بزرگ جوتوں کو لاکھ گھمایا پھرایا لیکن حسین کا گم شدہ جوتا، ان کے خلاف گواہی دینے کبھی نہیں آیا۔ لیکن اس احسان کے باوجود حسین صاحب نے اسے نہیں اپنایا۔ وہ ہٹے کٹے گھوڑوں کی ہی تصویر بناتے رہے۔ ان گھوڑوں کو نہ کبھی جوتا پہنایا اور نہ اس جوتے کو، جس نے عدالت میں غیر حاضر ہو کر کیس میں ان کا ساتھ نبھایا۔ اسے کبھی اپنے پیروں سے نہیں لگایا۔ حسین جسمانی لحاظ سے بھلے ہی دھان پان ہوں لیکن ان کے گمشدہ و باطلاق شدہ جوتے کافی بلوان ہیں۔ وہ جہاں بھی جاتے ہیں کئی سیاسی جوتے ان کا پیچھا کرتے ہیں۔ کبھی وہ جن سنگھی بن کر ان پر وار کرتے ہیں، کبھی ہندتوا کی شکل میں ان کو ڈراتے ہیں لیکن ان سارے جوتوں کے سامنے حسین کے وہ وفادار جوتے جن کو کبھی ان کا قرب حاصل نہیں ہوا، حسین صاحب کی حفاظت ہی نہیں کرتے ہزاروں، لاکھوں کی بھیڑ کا اکیلے مقابلہ کرتے ہیں اور اس

مقابلہ میں جیت بھی انھیں کی ہوتی ہے۔

بھارت میں قبل از تاریخ کے دور میں جوتا پہلی بار اساطیری حوالے میں ملتا ہے۔ اس وقت اس کا نام کھڑاؤں تھا اور اسے لکڑی سے بنایا جاتا تھا۔ رام کے پتا دشرتھ کی تین رانیاں تھیں۔ ان میں ایک کا نام کیکئی تھا۔ رام، پریوار میں سب سے بڑے ہونے کے ناطے راج گدی کے حقدار تھے۔ لیکن کیکئی اپنے بیٹے بھرت کو دشرتھ کو تخت کے وارث بنانا چاہتی تھی۔ اس نے چالاکی سے دشرتھ سے ایک خواہش پوری کرنے کا وعدہ لے لیا تھا۔ اس نے دشرتھ کو وہ وعدہ یاد دلا کر رام کو چودہ سال کے بن باس کے لئے مجبور کر دیا۔ رام پتا شری کے آدیش کو فرض مان کر محل چھوڑ کر چل دیے۔ لیکن کیکئی کا بیٹا بھرت، اپنے بڑے بھائی کا عقیدت مند تھا۔ وہ رام کو محل چھوڑنے سے روک تو نہیں پایا۔ لیکن اس نے رام کی راج گدی پر بیٹھنے سے بھی انکار کر دیا۔ اسنے اپنی ماں کی مرضی کے خلاف راج گدی پر رام کی کھڑاؤں رکھ دیں اور وہ چودہ برس تک ان کے واپس آنے کا انتظار کرتا رہا۔ ایودھیا میں جوتوں کی علامتی حکومت کی یہ پہلی مثال ہے۔

جوتوں کی دنیا کی ہر زبان میں الگ الگ نام ہیں۔ کہیں اسے 'شو' کہا جاتا ہے کہیں موجزی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ پاپوش اس کا نام ہے۔ کہیں جفتِ اس کا اسم ہے۔ کہیں زیر پائی مشہور ہے۔ کہیں کفش بولا جاتا ہے۔ اسی اعتبار سے جوتوں کے تعلق سے اردو لغت میں بہت سے محاوروں نے جنم لیا ہے۔ ان میں ایک محاورہ جوتیاں چٹخانا ہے۔ فسانۂ آزاد میں اسے یوں استعمال میں لایا گیا ہے۔ جھوٹ بونے والے خوشامد کرنے والے تو مزے اڑائیں اور علماء فضلاء جوتیاں چٹخائیں۔

روی داس، جنھیں رے داس بھی کہا جاتا ہے۔ سنت کبیر اور میراں بائی کے دور کے سنت کوی تھے۔ دیگر سنت کویوں کی طرح ان کی جائے پیدائش اور تاریخ ولادت کے تعین میں مختلف رائیں ملتی ہیں۔ وہ ذات سے چمار تھے۔ اپنے باپ کے ساتھ جوتے بناتے تھے اور اسی محنت سے روٹی کماتے تھے لیکن ان کا مزاج روحانی تھا۔ تجارت کے داؤں پیچ سے ناواقف تھے۔ سادھو سنتوں کو وہ اکثر مفت میں بھی جوتے پہنا دیا کرتے تھے۔ ان کی اس روش سے نالاں ہو کر ان کے باپ نے انھیں گھر دکان سے الگ کر دیا۔ ان کی شاعری میں رام رحیم دونوں ایک ہی نور کے نام تھے۔ میراں بائی انھیں

کی چیلی کہی جاتی ہیں۔ رے داس کے کئی پد سکھوں کے مقدس گرنتھ میں بابا فرید، کبیر، نام دیو کے ساتھ کافی تعداد میں شامل ہیں۔ رے داس کی بانی بھی کبیر کی طرح خدا کو رسوم کا پابند نہیں بناتی، ہر ذرے میں اس کا دیدار پاتی ہے۔ ان کے ایک پدم کی لائنیں ہیں :

''ترک مسیت (مسجد) اللہ ڈھونڈئی دہرے (مندر) ہندو رام گسائیں

روی داس ڈھونڈیا رام رحیم کوں، جہا مسیت دہرا نا ہیں............''

............☆............

نصرت ظہیر نے جوتے کو کئی زاویے سے دیکھا پرکھا ہے اور محظوظ ہونے کا موقع فراہم کیا ہے۔ جتنی پاسداری کے ساتھ پہلو تلاش کر کے انہوں نے روشناسی کا کام کیا ہے۔ یہ ان ہی کا حصہ ہے :

وحشت مآب، لغزیدہ عالم، مسخرۂ دو جہان و بوجہل دوراں جناب جارج بش نے جس دن یہ ارشاد فرمایا تھا کہ انہیں عراق میں بے حد خطرناک ہتھیار موجود ہونے کے بارے میں خفیہ ایجنسیوں سے ملنے والی اطلاعات غلط تھیں اور ان غلط اطلاعات پر یقین کرتے ہوئے عراق پر حملہ کرنے کی جو غلطی انہوں نے ازراہ تلطف فرمادی تھی اس پر اب انھیں افسوس ہے تو یہ سنتے ہی میری بائیں (یا شاید دائیں) آنکھ پھڑ کنے لگی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو فوراً ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا، والا شعر پڑھتا۔ مگر یہ بش صاحب تھے۔ ان کا بیان یا تصویر سامنے آنے پر شریف لوگوں کا ردِ عمل اتنا مہذب اور قاعدے کا کہاں ہوسکتا ہے۔ ان کے خلاف تو القاعدہ نے بھی کبھی کوئی قاعدے کا ردِ عمل ارشاد نہیں فرمایا۔ اور تو اور اکثر شرفا کے منہ سے بھی ان کی شان میں گالیاں نکلتے ہوئے ہی سنی ہیں۔ تاہم چونکہ خادم کا شمار ایسے شرفا میں نہیں ہے اس لئے بیان پڑھتے ہی منہ سے صرف لاحول کی دعا نکلی اور دل اس منافقانہ بیان پر یہ سوچ کر دھڑ کنے لگا کہ ضرور کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔

اور صاحب واقعی ایک دن وہ ہو گیا جو کچھ نہیں، بہت کچھ تھا۔

ایک دن صبح اٹھا تو دیکھا بیوی مسکرا رہی ہیں۔ بیوی کو غور سے دیکھا تو پتہ چلا وہ ٹی وی میں محو ہیں۔ اور ٹی وی کو دیکھا تو معلوم ہوا وہ حضرت بش پر جوتے برسانے میں مصروف ہے۔ پہلے تو آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ یہاں تک کہ بازو میں چٹکی بھری تب بھی یہی محسوس ہوا کہ کوئی خواب دیکھ

رہا ہوں۔ آخر جب بیوی کے بازو میں چٹکی لی تب جا کر معلوم ہوا کہ میں واقعی جاگ رہا ہوں اور بش صاحب پر واقعی ایک صحافی جوتے برسا رہا ہے۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ سب آپ جانتے ہیں۔ عراقی صحافی پوری عرب دنیا کا ہیرو بن گیا۔ نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر، صحافی کی رہائی کے لئے مظاہرے شروع ہو گئے۔ جوتے بیچنے والے اس جستجو میں لگ گئے کہ وہ جوتے کس کمپنی کے تھے جن سے جناب بش کو مشرف ہونا تھا۔ جوتے بنانے والی کمپنیاں لوگوں کو یہ کہہ کر رجھانے لگیں کہ یہ جوتے ہمارے بنائے ہوئے، یا ہمارے ڈیزائن کئے ہوئے تھے۔ انٹرنیٹ پر بش کو جوتے مارنے کے الیکٹرانک گیم شروع ہو گئے، جن پر بش کو لگنے والے جوتوں کا شمار درج ہونے لگا اور چند روز میں ہی شمار کروڑوں تک پہونچ گیا۔ خود صحافی کے جوتے کی قیمت بھی کروڑوں روپے تک جا پہونچی اور صاحب ثروت لوگ اس تاریخی جوتے کی جوڑی کو خریدنے کے لئے بڑھ چڑھ کر بولی لگانے لگے۔ کہیں سے خبر نکلی کہ جوتے کا فاعل کنوارا ہے۔ پھر کیا تھا۔ عرب دوشیزاؤں کی طرف سے صحافی کو شادی کے پیغام ملنے شروع ہو گئے۔

خادم کا شمار اگرچہ کم پڑھے لکھے لوگوں میں ہوتا ہے (تاہم اس قدر کم پڑھے لوگوں میں بھی نہیں کہ اُس پر اردو پروفیسر ہونے کا شبہ کیا جانے لگے) پھر بھی جتنی تاریخی کتابیں مولانا صادق حسین سردھنوی کی کتابوں کے علاوہ اُس نے پڑھی ہیں ان کی گواہی دے کر وہ کہہ سکتا ہے کہ دنیا کی تاریخ میں آج تک کسی جوتے کو اتنی عزت و توقیر میسر نہیں ہوئی جتنی اس صحافی کے جوتے کو ملی ہے۔ اور یہ دنیا کا واحد جوتا ہے جس کی قسمت پر آج تاج شاہی بھی رشک کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے بس روس کے رہنما نکیتا خرشچیف کے جوتے کو تھوڑی بہت شہرت ملی تھی جو انہوں نے 1960ء کے کیوبا بحران کے دنوں میں امریکہ کو یو این او میں دکھایا تھا۔

طنز و مزاح کے مشہور شاعر ہلال سیوہاروی کو اپنے وقت کا مشہور ترین شاعر بنانے میں بھی جوتے کا بڑا ہاتھ تھا۔ بلکہ کہنا چاہئے، جوتے کا بڑا پاؤں تھا کہ جوتا بالعموم پاؤں میں ہی پہنا جاتا ہے۔ دولت، طاقت اور حکومت کئی سروں کو بھی جوتے پہنا دیتی ہے۔ جو عرف عام میں ٹوپی، دستار اور پگڑی کا خطاب پاتے ہیں۔ مگر وہ قصہ اور ہے۔ خیر، ہلال سیوہاروی نے جوتے پر ایک نظم کہی تھی

جس نے اس دور میں مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑ دئے تھے۔ جس مشاعرے میں بھی ہلال جاتے وہاں پہلے انھیں یہ نظم سنانا پڑتی تب جا کر لوگ ان کا تازہ کلام سننے پر راضی ہوتے۔ کئی بار فرمائش اتنی بڑھ جاتی کہ سامعین جوش میں آکر اسٹیج پر جوتے چپل پھینکنے لگتے، اور ہلال اس ڈر سے نظم سنانا شروع کر دیتے کہ کہیں لوگ انہیں جوتے سے ہی نہ پیٹ دیں اور جس کا جوتا اس کا سر، والی کہاوت خود ان کے سر پر نہ صادق آجائے۔

یہ نظم دراصل انہوں نے کسی صوبائی اسمبلی میں ممبروں کے درمیان جوتے چلنے کے واقعے سے متاثر ہو کر کہی تھی۔ آخر جب ہماری پارلیمانی جمہوریت میں جوتے کی روایت پختہ اور مستحکم و مضبوط ہوگئی اور لوگوں نے اسمبلی یا پارلیمنٹ میں جوتے چلنے پر حیران ہونا بند کر دیا تب جا کر ہلال صاحب کا اس نظم سے پیچھا چھوٹا اور تب ان کی دوسری نظموں کو مقبولیت مل پائی جن میں ایک دل چسپ نظم مچھر پر تھی۔

خود مجھے بطور صحافی اس جوتے پر رشک آرہا ہے جس سے جناب بش کا سر بال بال بچا تھا۔ عام طور پر صحافی قلم سے خبریں لکھتے ہیں۔ یہ پہلا موقع ہے جب کسی صحافی نے جوتے سے خبر تحریر کی ہے۔ قلم کی عظمت و حرمت اور طاقت اپنی جگہ۔ لیکن صحافی ایماندار اور جری ہو تو اس کا جوتا بھی کچھ کم نہیں ہوتا۔ نہ عظمت و حرمت میں نہ طاقت میں۔ عظمت ایسی کہ دنیا جوتے کے مالک کو سلام کر رہی ہے۔ حرمت وہ کہ بش پر پھینکا گیا تھا اس لئے لوگ جوتے کو بھی چومنے کے لئے تیار ہیں۔ اور طاقت و ہیبت اتنی کہ دنیا کے سب سے بڑے جوہری اسلحہ خانے کی چابی کا مالک ہونے کے باوجود آدمی ایک معمولی اور حقیر جوتے کیا آگے بے بس نظر آیا۔ مرزا آج ہوتے تو شاید کہتے :

حیف اس چار گرہ چمڑے کی قیمت غالب
جس کی قسمت میں ہو مظلوم کا جوتا ہونا

ابھی تک ایٹم بم اور ہائڈروجن بم کو سب سے خطرناک ہتھیار سمجھا جاتا تھا۔ لیکن صحافی کا جوتا خطرناکی میں ان بموں سے بھی آگے نکل سکتا ہے یہ بغداد کی پریس کانفرنس میں ساری دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر سمجھ لیا ہے۔ ہاں اتنی یکسانیت ایٹم بم اور جوتے میں ضرور ہے کہ نشانے پر نہ لگیں

تب بھی ناقابلِ تلافی نقصان پہونچاتے ہیں۔ جیسے بش کو پہونچایا ہے۔ ایک ٹی وی چینل نے بہت صحیح تبصرہ کیا "جوتا وہ ہتھیار ہے جو کسی کو لگے یا نہ لگے لیکن اس کا وار کبھی خالی نہیں جاتا۔"

لیکن صاحب یہ بش باپ بیٹے بھی کیا خوب قسمت لے کر پیدا ہوئے ہیں۔ پہلے والد بش نے اس طور پر جوتے کھائے کہ صدام حسین نے ان کی فرشی تصویر ایک ہوٹل کے دروازے کے قریب بنوا دی تھی۔ چنانچہ جو ہوٹل میں آتا جاتا بش کے چہرے پر پاؤں رکھ کر گزرتا۔ اور ظاہر ہے پاؤں میں جوتے بھی ہوتے (کیا عجب کہ مذکورہ صحافی بھی کبھی اس ہوٹل میں جوتوں سمیت گیا ہو)۔ پھر جب فرزند بش کا دوسرا اقتدار خاتمے کو پہونچا تب عراق کے ہی ایک جوتے نے ان کے چہرے کو بھی قریب سے دیکھ لیا۔ فرق بس اتنا رہا کہ بش کلاں کا چہرہ نقلی تھا اور بش خورد کا اصلی۔ تاہم دونوں بشوں پر پڑنے والے جوتے بالکل اصلی تھے۔ اس طرح بڑا بش ہو یا چھوٹا بش دونوں کی ہی قسمت میں جوتے لکھے تھے۔

ویسے دیکھا جائے تو بڑے بش اس لحاظ سے خوش قسمت تھے کہ ان کے دور میں کوئی نائن الیون نہیں ہوا۔ جب کہ چھوٹے میاں کے پہلے دور میں پہلا نائن الیون ہوا اور دوسرے دور میں دوسرا۔ مطلب یہ کہ جوتے کا واقعہ بھی امریکیوں کے لئے کسی نائن الیون سے کم نہیں۔ جس طرح پہلے والے نائن الیون نے دنیا کو بدل کر رکھ دیا تھا اسی طرح جوتوں والے نائن الیون نے بھی دنیا کو بدلنا شروع کر دیا ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ عراق میں امریکی فوجیوں کو جوتوں کی دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے محتاط رہنا پڑتا ہے۔ امریکہ میں لوگ غیر امریکی راہگیروں کے بغیر فیتے والے جوتوں کو خشمگیں آنکھوں سے دیکھنے لگے ہیں۔ سیکیورٹی والوں کے سر پر بھی جوتا سوار ہو گیا ہے اور وہ سوچنے لگے ہیں کہ کیوں نہ بغیر فیتے والے جوتوں پر پابندی لگوادی جائے۔ کچھ ماہرین تو جوتوں کا تسمہ ہمیشہ بندھا رکھنے کا قانون بنانے کی صلاح دے رہے ہیں۔ کچھ کا کہنا ہے کہ جوتوں کو مقفل کرا دیا جائے اور جس راہگیر کا بھی کوئی جوتا غیر مقفل ملے اسے (راہگیر کو) حفظِ ماتقدم کے طور پر حوالات میں بند کر دیا جائے۔

میڈیا کی دنیا میں بھی جوتے کا اثر دکھائی دینے لگا ہے۔ سیکیورٹی والے آج کل بنا تسمے کا جوتا

پہنے رپورٹر پر خاص نظر رکھتے ہیں۔ ایک پریس کانفرنس میں کسی رپورٹر نے جس کا نیا جوتا پاؤں میں کاٹ رہا تھا ذرا آرام کے لئے جوتا اتار کر ہاتھ میں لیا ہی تھا کہ رپورٹروں میں بھگدڑ مچ گئی اور پریس کانفرنس کرنے والے لیڈر جھٹ اپنی اپنی میز کے اندر دبک گئے۔ پرانی دہلی کے ایک لیڈر کے بارے میں سنا گیا کہ انہوں نے اپنے اُس کمرے میں میز کرسیاں ہٹا کر دبیز قالین بچھوالئے ہیں جہاں وہ علاقے کے ووٹروں اور اخبار رپورٹروں سے ملاقات کیا کرتے ہیں۔ اب وہ میز کرسی کے بجائے گاؤ تکیہ لگا کر قالین پر بیٹھتے ہیں اور ملاقاتیوں کو ان سے ملنے کے لئے اپنے جوتے باہر اتار نے پڑتے ہیں جہاں بیٹھا ہوا ایک خادم جوتے اترتے ہی جھپٹ کر انہیں (جوتوں کو) اپنی تحویل میں لے لیتا ہے۔ میرا خیال ہے یہ سب چلتا رہا تو ہوسکتا ہے آئندہ چل کر جوتے پہننے کے لئے بھی اسی طرح لائسنس لینا پڑے گا جس طرح آج کل پستول اور بندوق رکھنے کے لئے لینا پڑتا ہے۔

اور صاحب چلتے چلتے بریکنگ نیوز بھی سن لیجئے۔ ابھی یہ سطریں لکھی ہی تھیں کہ خبر آئی ہے، بغداد میں امریکی حکام نے وہ جوتے جلا کر تلف کر دئے ہیں جو بش صاحب پر پھینکے گئے تھے۔ کہا گیا ہے کہ جوتے سے متعلق مقدمے کی سماعت کرنے والے عراقی جج نے ثبوت کو ضائع کرنے سے انھیں کافی روکا مگر حکام نے یہ بہانہ بنا کر جوتے جلا دئے کہ وہ دیکھنا چاہتے ہیں جوتے کے اندر کوئی بم تو چھپا ہوا نہیں ہے۔ ان کم عقلوں کو یہ بھی نہیں سوجھا کہ جوتا تو خود ایک بم ہے۔ بم کے اندر بم چھپانے کی کسی کو کیا ضرورت؟ اور اس جوتے میں جو بم تھا وہ تو پریس کانفرنس میں ہی چل چکا تھا۔ لہذا بے چارا باقی بچا ہوا جوتا خاموشی سے جل کر راکھ ہو گیا۔ میرے خیال سے یہ تاریخ کا پہلا متبرک جوتا ہے جس نے "شہادت" کا درجہ پایا۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ امریکی اہلکاروں نے اس کند ذہنی کا مظاہرہ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہوگا۔ وہ سوچ رہے ہوں گے کہ جب تک جوتا زندہ رہے گا تب تک امریکی صدر کی بے عزتی کا یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ لہذا اسے ابھی مار دیا جائے۔ مگر شاید وہ نہیں جانتے کہ سب جوتے مرا نہیں کرتے۔ جوتے صرف وہ مرتے ہیں جو گھس گھس کر چلائے جاتے ہیں۔ جن جوتوں کو احتجاج بنا دیا گیا ہو وہ صفحہ ہستی سے ہوسکتا ہے کہ مٹ جائیں مگر ذہنوں میں وہ ہمیشہ سانس لیتے رہتے ہیں۔ جس طرح شہید انسان کبھی مرتے نہیں اسی طرح شہید جوتا بھی

کیسے مر سکتا ہے۔

نصرت ظہیر جوتے کو صحافت سے جوڑتے ہوئے عالمی سیاسی گلیارے تک پہنچتے ہیں :

جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے، تبدیلیوں کی رفتار بھی تیز سے تیز تر ہوتی جاتی ہے۔ ابھی تک دنیا نے قلم کی صحافت دیکھی تھی۔ اب وہی دنیا جوتے کی صحافت دیکھ رہی ہے۔ پہلے کبھی مشاعروں میں ہوا کرتا تھا کہ شاعر کا کلام یا ترنم سامعین کو پسند نہیں آیا تو اس پر سڑے ہوئے انڈے یا ٹماٹر پھینک کر ذائقہ تبدیل کر لیا۔ اور یہ چیزیں دستیاب نہ ہوئیں تو اسٹیج پر جوتے اچھال کر شاعر سے اس کی غزل کو یا منتظمین سے اُس شاعر کو بدلوا لیا۔ تھوڑی بہت اہمیت شادی بیاہ کے موقع پر بے چارے کی تب ہو جاتی تھی جب اسے دولہے نے پہن رکھا ہو اور سالیوں نے چھپا لیا ہو۔

لیکن جوتا صحافت میں بھی داخل ہو سکتا ہے یہ کبھی کسی نے نہیں سوچا تھا۔ جوتا پہن کر آپ پاؤں کو تکلیف پہونچائے بغیر چل سکتے ہیں، دوڑ سکتے ہیں۔ بہت ہوا تو جوتے پر روٹی رکھ کر دے سکتے ہیں یا جوتیوں میں دال بھی بانٹی جا سکتی ہے۔ لیکن صرف محاورتاً۔ اگر عملاً آپ نے کسی کو دال روٹی کھلانے کا یہ طریقہ استعمال کر لیا تو سمجھ لیجئے وہ جوتم پیزار ہوگی اور وہ جوتا آپ کے سر پر برسے گا کہ تھوڑی ہی دیر میں جوتیاں بغل میں داب کے بھاگتے نظر آئیں گے۔ یا پھر بہت دور کی کوڑی لائی جائے تو صحافت میں جوتے کے کردار کو صرف اس طرح ثابت کیا جا سکتا ہے کہ مولانا حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا ظفر علی خاں بھی جوتے پہنتے تھے اور جوتے پہن کر صحافت کرتے تھے۔

مگر آفرین ہے الیکٹرانک میڈیا کو۔ اس نے صحافیوں کے ہاتھ میں یک لخت ایک نیا آلہ تھما دیا ہے اور صحافی اب قلم کی بجائے جوتے کی نوک سے خبریں لکھنے لگے ہیں۔

وقت بڑا ظالم ہے۔ اچھی چیزوں کو بہت جلد بھلا دیتا ہے۔ چنانچہ دنیا کے سب سے عظیم جوتے کو بھی لوگ بھولنے لگے تھے۔ خدا بھلا کرے دہلی کے جرنیل سنگھ جرنلسٹ کا کہ اس نے چدمبرم کی طرف جوتا اچھال کر اس یاد کو پھر تازہ کر دیا۔ اس پر غضب یہ ہوا کہ چدمبرم نے نہ صرف جوتے کے فاعل کو معاف کر دیا بلکہ اس کے فعل کی بھی تائید کر دی جس کے نتیجے میں دنیا کی سب سے بڑی

جمہوریت نے سر تسلیم خم کر دیا اور یوں یہ تازہ جوتا بھی حیات جاودانی پا گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ جوتے کے بھاؤ آسمان پر پہونچ گئے۔ اور آج دیکھ لیجئے، جوتوں کے فاعل عوام ترقی کی دوڑ میں بے شک ایک انچ آگے نہ بڑھ رہے ہوں لیکن جوتا ہر طرف چل رہا ہے۔ بلکہ دوڑ رہا ہے۔

دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ کئی بار کسی چیز کی اہمیت کو پہچاننے میں صدیاں لگ جاتی ہیں اور وہ اچانک کسی معمولی سے واقعے کی بدولت پورے عالم انسانیت پر آشکار ہوتی ہے۔ سیب کو ہی لے لیجئے۔ ایک عام سا پھل ہے۔ اس کی افادیت محض اتنی تھی کہ محبوب کے رخساروں کو اس سے تشبیہ دے کر بدنام عاشق اپنی حسرتوں کو اور ناکام شاعر اپنے شعروں کو چمکا لیا کرتے تھے۔ لیکن جب وہ نیوٹن کے سر پر گرا تو کیا زبردست تماشہ ہوا۔ لاکھوں برسوں سے انسان اس زمین پر گرتا پڑتا آیا تھا مگر یہ نہیں جانتا تھا کہ اُسے گرانے اور لڑھکانے میں اصل ہاتھ زمین کی کشش ثقل کا ہے۔ سیب نے نیوٹن کے سر پر گر کر بتا دیا کہ وہ نہ صرف آدم وحوا کو فردوس بدر کرانے کی بلکہ کرۂ زمین کو زیر وزبر کرنے کی طاقت بھی رکھتا ہے اور کرۂ زمین ہی کیوں اس واقعے نے پوری کائنات کو ہی گردش میں ڈال دیا۔ کوئی مانے یا نہ مانے سچ یہی ہے کہ زمین سورج چاند ستارے اور کہکشاں وغیرہ آج نیوٹن کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق ایک دوسرے کے آگے پیچھے گھوم رہے ہیں۔ نیوٹن نہ ہوتا تو غلط فہمی میں عبدالقدیر جیسے نہ جانے کس سائنس داں کے اصولوں پر گھومتے ہوئے کبھی کے ایک دوسرے سے ٹکرا کر بھسم ہو گئے ہوتے۔

کچھ یہی معاملہ جوتے کا ہے۔ انسانی تہذیب میں یہ تب سے موجود ہے جب حضرتِ انسان نے دونوں پاؤں پر چلنا شروع کیا تھا۔ اس کے بعد یہ مختلف حوالوں سے ہماری زندگی میں دخیل ہوتا رہا۔ لسانیات میں بھی اس کا کچھ کم دخل نہیں۔ لوگوں کی زبان پر چڑھ کر جوتے نے بیسیوں محاورے ایجاد کر دیئے ہیں۔ جیسے، جوتا برسنا، جوتا چلنا، جوتا چھلنا، جوتا اٹھانا وغیرہ۔ بلکہ جوتے کی مادہ تو اور بھی زرخیز نکلی۔ جوتی کی نوک پر رکھنا، جوتی پر جوتی چڑھنا، جوتی خورا، جوتی کاری، جوتی کو غرض، جوتی پر کا جل، جوتی کا یار، جوتیاں بغل میں دابنا، جوتیاں توڑنا، جوتیوں میں دال بٹنا، جوتی پر رکھ کر روٹی دینا...... نہ جانے کتنے محاورے اب تک وہ اردو کو دے چکی ہے اور نہ جانے کتنے اور دے گی۔

مگر ان تمام محاوروں میں جوتے کی ہتک اور بے قدری قدرِ مشترک کے طور پر شامل رہی۔ سب سے پہلے غالباً ڈاسن اور باٹا نے جوتے کی اہمیت کو پہچانا تھا۔ انہوں نے پوری دنیا میں اپنے کارخانوں کے جوتوں کی بدولت جو عزت اور شہرت کمائی وہ اظہر من الشمس ہے (اس محاورے کا استعمال راقم نے اندازاً کرلیا ہے، مطلب جاننے کے لئے فیروز اللغات سے رجوع فرمائیں)۔

ڈاسن اور باٹا نے جدید ترین مارکیٹنگ اسٹریٹیجیز کو بروئے کار لاتے ہوئے جوتے کو زمین پر چار کھونٹ چلا دیا اور دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت جوتے وجود میں آ گئے۔ لیکن رہا وہ پاؤں میں ہی۔ چنانچہ مندر مسجد میں اس کا داخلہ آج تک بند ہے۔ بلکہ جمعہ کی نماز میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ چوری کے خدشے سے بے چارے نمازی انھیں احتیاطاً سر کے سامنے رکھ کر سر بہ سجود ہوتے رہتے ہیں اور کئی بار دیکھ کر سمجھ میں نہیں آتا کہ کون کسے سجدہ کر رہا ہے اور کس کی نماز قبول ہو رہی ہے۔

جوتے کی یہ طاقت کہ وہ خرشچیف جیسے سیاست داں کے ہاتھ میں آئے تو یو این او کو، منتظر الزیدی کے ہاتھ میں ہو تو دنیا کی سب سے بڑی ایٹمی طاقت کو اور جرنیل سنگھ کو مل جائے تو سب سے بڑی جمہوریت کو شرمندہ کرسکتا ہے۔ حال ہی میں ذہنوں پر آشکار ہوئی ہے۔ ذرا سوچیے، نیوٹن کے سر پر سیب کی بجائے کوئی جوتا گرا ہوتا تو کیسا غضب ہوتا۔ یہ بھی پتہ نہیں اس کی عقل کشش ثقل کی طرف جاتی یا نہ جاتی اور سیارگان و دیگر اجرام فلکی نہ معلوم کس سائنسداں کی کس تھیوری پر چلتے ہوئے کس طرف مڑ گئے ہوتے۔

اب صحافیوں کے ہاتھ میں جوتا آ گیا ہے تو دیکھئے آگے آگے کیا ہوتا ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ صحافتی تربیت کے کورس میں جوتا پھینکنے کی مہارت کو بھی جلد ہی بطور ذیلی مضمون شامل کرلیا جائے۔ یونی ورسٹیوں میں صحافی طلبا کے لئے جوتا پھینکنے، اچھالنے یا مارنے کا ہنر سکھانے والے کوچ مقرر ہو جائیں اور اس کے لئے باقاعدہ ورک شاپ منعقد ہونے لگیں۔

دوسری طرف سیاسی رہنماؤں کو بھی اس نئی دہشت گردی کا سامنا کرنے کے لئے احتیاطی تدابیر کرنی ہوں گی۔ پریس کانفرنسوں کے لئے نئے ضوابط و قواعد وضع کرنے ہوں گے۔ ہوسکتا ہے صحافیوں کے جوتے پہننے پر ہی پابندی لگ جائے۔ یا جوتوں کا لائسنس لینا لازمی ہو جائے، کیونکہ یہ تو

ثابت ہو ہی چکا ہے کہ یہ ایٹم بم سے بھی زیادہ طاقت ور ہتھیار ہے۔ اب جب کہ تھری ناٹ تھری جیسی بے ضرر بندوق رکھنے پر بھی اس قدر پابندی عائد ہے تو جوتا تو ہلاکت خیزی میں اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔ تھری ناٹ تھری کی گولی تو نشانے پر لگنے کے بعد ہی ہلاک کرتی ہے جب کہ جوتے کا صرف نشانے پر پھینکا جانا کافی ہے۔ یہ وہ ہتھیار ہے جو نشانے پر لگے یا نہ لگے اس کا وار کبھی خالی نہیں جاتا۔ یعنی لیڈر حضرات پریس کانفرنس یا جلسے میں ہیلمٹ وغیرہ پہن کر آئیں تب بھی وہ جوتے سے نہیں بچ سکتے۔ ایک بار کسی کا جوتا انھیں دیکھ کر اچھل پڑا تو انھیں لگے گا ضرور۔ چنانچہ ہوسکتا ہے آئندہ صحافیوں سے ان کے جوتے باہر ہی اتروا لیے جایا کریں۔ یا جیسا کہ ایک ٹی وی چینل نے مشورہ دیا، پریس کانفرنسیں مندر مسجد جیسی عبادت یا زیارت گاہوں میں کرائی جانے لگیں جہاں صحافیوں کو خود ہی جوتے باہر اتارنے پڑیں گے۔

میں سمجھتا ہوں، دوسرے معاملات کی طرح جوتے سے جڑے مسائل کو حل کرنے میں بھی ٹیکنالوجی ہی ہماری مدد کرے گی۔ ہوسکتا ہے ہر جوتے میں الیکٹرانک چپ لگا ہوا ہو جس سے اس کی نقل وحرکت پر خفیہ طور سے نظر رکھی جا سکے۔ یہ چپ جوتے میں لگے ہوئے الیکٹرانک تھنگ سے منسلک ہوگا اور جیسے ہی جرنلسٹ پریس کانفرنس کی جگہ پر آئیں گے ریموٹ کنٹرول سے سب کے جوتے اسی طرح جام ہو جائیں گے جس طرح پارلیمنٹ واسمبلی میں موبائل فون جام کر دیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد احتجاج تو کیا پاؤں کھجانے کے لیے بھی صحافی جوتا اتارنا چاہے گا تو نہیں اتار سکے گا۔

اس میں بس ایک ہی اندیشہ ہے۔ جس طرح القاعدہ اور طالبان نے خودکش بم ایجاد کر لیے ہیں اسی طرح کہیں خودکش جوتے نہ معرض وجود میں آ جائیں۔ یہ اس قدر عجیب اور ہولناک خیال ہے کہ مجھے اس پر مزید سوچتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے، لہٰذا اتنا سوچنے کو کافی جانیں اور خادم کو دعائے خیر میں یاد رکھیں!

☆

جوتے کا بھی ایک نصب العین ہوتا ہے۔ ایک مدار ہے جس کے ارد گرد گھومنا اب فخر سمجھا جانے لگا ہے کہ اس کی فطرت نے گردش کو اہمیت دینی شروع کر دی ہے۔ عطاءالحق قاسمی نے اسے

ہتھیار بتایا ہے :

دنیا کے مسلمان حکمرانوں کے محبوب امریکی صدر جناب جارج بش کے ساتھ عراقی صحافی منتظر زیدی نے کچھ کیا اچھا نہیں کیا۔ جناب بش طویل سفر طے کر کے عراق کے ان عوام سے الوداعی ملاقات کے لئے آئے تھے جو امریکہ کی تمام تر کوشش کے باوجود امریکی بمباری میں ہلاک ہونے سے بچ گئے تھے۔ حکمراں جب حکمرانوں سے ملتے ہیں تو ان کی اس ملاقات کو عوام سے ملاقات ہی کا نام دیا جاتا ہے۔ چنانچہ جب وہ عراقی یعنی وزیر اعظیم سے ہاتھ ملا رہے تھے تو ایک جوتا ہوا میں تیرتا ہوا جناب بش کی کھوپڑی کی طرف آتا دکھائی دیا جو جناب بش کے فوری طور پر جھک جانے کی وجہ سے ان کے سر کے لمس سے محروم رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ جوتا اس سعادت سے محروم رہنے پر ساری عمر کف افسوس ملتا رہے گا۔ اگر جناب بش اس جوتے کے وار سے بچنے کے لئے فوری طور پر سر نہ جھکاتے اور یوں یہ اپنے صحیح نشانے پر جا لگتا ہے تو یہ اس قابل تھا کہ اسے عالمی لیبیاریٹریوں میں بھیج دیا جاتا تاکہ دنیا کو معلوم ہو سکتا کہ بش کی کھوپڑی کے اندر بھی کچھ تھا یا نہیں، میں جانتا ہوں کہ اس جوتے میں کیمرے فٹ نہیں تھے لیکن کھوپڑی سے ٹکرانے کی صورت میں وائبریشن (ارتعاش) پیدا ہوتا اس سے بہت کچھ پتہ چل سکتا تھا۔ ویسے اگر یہ کھوپڑی کسی اور کی ہوتی تو جوتے کے اتنے قریب سے بھی ارتعاش پیدا ہو سکتا تھا مگر یہ کھوپڑی تو جناب جارج بش کی تھی! جوتا صحیح نشانے پر آتا دیکھ کر اگرچہ جناب بش نے سر نیچا کر کے خود کو اس جوتا پریڈ سے بچالیا لیکن ایک بات اس سے بہرحال ثابت ہوگئی اور وہ یہ کہ امریکہ دوستوں سے بات کرتے ہوئے اکڑ اکڑ بات کرتا ہے لیکن جب کوئی اسے جوتے کی نوک پر رکھتا ہے تو پھر وہ فوراً جھک جاتا ہے۔ بطور مثال ایران، شمالی کوریا اور وینزویلا کے نام پیش کئے جاسکتے ہیں۔ امریکہ خیالی کردار ''پھنے خان'' جیسا ہے جو لوگوں کو مسلسل ڈرانے میں لگا رہتا ہے لیکن جب یہ دیکھتا ہے کہ وہ نہیں ''ڈر'' رہے تو خود ڈر جاتا ہے۔ اخبارات میں عراقی صحافی منتظر زیدی کی طرف سے کی گئی ''چاند ماری'' کی مرحلہ وار تصاویر شائع کی گئی ہیں۔ پہلی تصویر میں بش بہت اکڑ خان نظر آرہے ہیں۔ دوسری تصویر میں اپنی طرف اڑ کر آتا ہوا جوتا دیکھ کر ان کا رنگ اڑتا دکھائی دیتا ہے اور آخری تصویر میں وہ بھیگی بلی جیسے نظر آتے ہیں۔ اس کے ساتھ ان کا

بیان بھی شائع ہوا ہے جس میں وہ اپنی خفت چھپانے کے لئے جولی موڈ میں نظر آنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ کہتے ہیں میں نے یہ جوتا دیکھ کر اندازہ لگایا ہے کہ یہ دس نمبر کا تھا۔ میرے خیال میں انہیں بھی شاید یہ علم ہے کہ دس نمبری کیا ہوتا ہے۔ تاہم سچی بات یہ ہے کہ انہیں جوتے کے جواب میں اس خوش مزاجی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے تھا جس سے یار لوگ یہ اندازہ لگاتے ہیں کہ انہیں اپنا یہ عوامی استقبال پسند آیا ہے۔ دنیا بھر میں امریکی حکمرانوں کے لئے محفوظ ترین جگہ پریس کانفرنس ہال ہی تھے، کیوں کہ صحافی پیشہ ور لوگ ہوتے ہیں اور یوں اپنے جذبات کے تابع ہوتے ہیں۔ وہ اس بات کا تصور بھی نہیں کرسکتے کہ اپنے کسی مہمان پر جوتے جیسے ہتھیار سے حملہ آور ہوں۔ وہ یہ کام اپنے لفظوں سے لیتے ہیں۔ چنانچہ عراقی صحافی نے جو کچھ کیا اس سے ان کے اور پوری دنیا کے مظلوم عوام کے جذبات کی عکاسی تو ہوگئی لیکن بہر حال یہ ایک ایسی حرکت تھی جس کی اجازت صحافت کی اخلاقیات میں نہیں رہی۔ بش پر جوتا پھینکنے سے پہلے انہوں نے مسلم امہ پر بش کے مظالم پر اپنے جذبات کا اظہار اپنی جان پر کھیل کر کیا ورنہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ غیر معمولی شخص بجا طور پر ساری دنیا کی نظروں کا محور بنا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بش کے باقی ماندہ دوروں میں کس نوع کی حفاظتی تدابیر کی جائیں تاکہ ان کی عزت (اگر کوئی ہے) محفوظ رہے ہمارے محترم خبر نگار ساتھی نے اپنی تجویز نما خبر میں بتایا ہے کہ آئندہ صحافیوں کو پریس کانفرنس میں جوتے پہن کر آنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ یہ منظر عجیب ہوگا بلکہ اس سے کئی غلط فہمیاں بھی پیدا ہوسکتی ہیں۔ کیوں کہ جوتے اتار کر مسجد یا کسی دربار ہی میں جایا جاتا ہے چنانچہ مجھے شک ہے کہ مسلمان صحافی جناب بش کو یہ عزت دینے پر تیار نہیں ہوں گے۔ ایک حفاظتی تدبیر یہ بھی ہوسکتی ہے کہ پریس کانفرنس میں آنے والے صحافیوں سے حلف اٹھوایا جائے کہ وہ اپنے پاؤں جوتوں سے نہیں نکالیں گے۔ اس کے جواب میں ہمارے صحافی کہیں یا نہ کہیں کہ حلف کا کیا ہے وہ تو ہمارے فوجی بھائی بھی اٹھاتے ہیں کہ وہ ہر قسم کے مذہبی تعصب سے پاک رہیں گے۔ ایک تجویز یہ بھی پیش کی جاسکتی ہے کہ پریس کانفرنس میں شرکت کے لئے صحافیوں پر پابندی ہو کہ ایسے جوتے پہن کر آئیں جو اتنے ہلکے ہوں کہ ایک آدھ فٹ سے آگے پرواز ہی نہ کرسکیں۔ اس کے علاوہ یہ احتیاط بھی کہ صحافیوں میں کوئی زیدی نہ ہو۔

بہر حال حفاظتی تدابیر تشکیل دینا امریکی سیکورٹی والوں کا کام ہے اور امید ہے کہ اس حوالے سے ایسے حفاظتی انتظامات کریں گے کہ بہت سے لوگ صحافت کے پیشے کو الوداع کر دیں گے۔ بش نے اپنے آنے پر دنیا کو پریشان کیا تھا۔ ان کے جانے پر بھی کچھ نہ کچھ تو ہوگا۔!

☆

وجاہت علی خاں صحافیوں کے جوتے سے انکشاف کے در وا کرتے ہیں اور کتنے ہی انکشافی خط دخال کو واضح کرتے ہیں :

دسمبر 2008ء کو عراق سے شروع ہونے والی کہانی براستہ کیمبرج یونیورسٹی برطانیہ اور بھارت تک پہنچ چکی ہے، اس جوتا کہانی کے مصنف اور سرخیل عراقی صحافی منتظر الزیدی ہیں جنہوں نے اس وقت دنیا کے سب سے زیادہ طاقتور انسان جارج ڈبلیو بش پر جوتے پھینک کر دنیا کو چونکا دیا تھا۔

دوسرا واقعہ برطانیہ کے شہر کیمبرج میں ہوا جب چین کے وزیر اعظم ون جیاہا کیمبرج یونیورسٹی میں تقریر کر رہے تھے تو ایک دل جلے نے ان پر جوتا پھینکا۔ اور اب تیسرا واقعہ بھارت میں ہوا جب وزیر خارجہ چدم برم پر ایک پریس کانفرنس کے دوران بھارتی صحافی جرنیل سنگھ نے اپنا جوتا پھینکا، لیکن ایک قدر مشترک ان تینوں واقعات میں یہ رہی کہ کوئی بھی جوتا اپنے ٹارگیٹ کو چھو تک نہیں سکا۔ کیا یہ محض ایک اتفاق ہے؟

میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کی صحافی برادری کے لئے یہ صورتحال ایک لمحہ فکریہ ہے کہ صحافیوں کا نشانہ کس قدر کمزور ہے کہ اتنے قریبی فاصلے سے بھی ان کا نشانہ چوک جاتا ہے اور پھر یہ ساری دنیا کی صحافتی کمیونٹی کے لئے باعث ندامت ہوتا ہے۔ اس ضمن میں میری تجویز اور اپیل صحافتی اداروں اور صحافیوں کی تنظیموں سے یہ ہے کہ وہ اپنے ''کوڈ آف آتھکس'' میں یہ نکتہ شامل کریں کہ یا تو کوئی صحافی آئندہ کسی سیاسی لیڈر کو جوتا مارے نہیں اور اگر مارے تو وہ عین نشانہ پر لگنا چاہئے تاکہ مقصد پورا ہو سکے۔ لیکن یہ ''کوڈ آف آتھکس'' بنانے سے پہلے یہ بھی ضروری ہے کہ خصوصی طور پر پولیٹیکل رپورٹنگ کرنے والے صحافیوں کو نشانہ بازی کا ایک لازمی کورس کروایا جائے اور اس کورس میں کینچے کھیلنے کی پریکٹس لازمی اور زیادہ سے زیادہ کروائی جائے۔

مجھے ایک افسوس یہ بھی ہوتا ہے کہ جوتا پھینکنے جیسے بے ضرر اور سستے مشغلے میں بھی پاکستان، بھارت بلکہ عراق جیسے تباہ حال ملک سے بھی پیچھے رہ گیا حالانکہ اس معیار پر پاکستان کے چھوٹے بڑے سینکڑوں سیاستدان پورا اتر سکتے ہیں، کیونکہ ہمارے سیاستدان نہ تو کسی سوال کا درست جواب دیتے ہیں اور نہ ہی ان کے جواب کی واضح سمجھ آتی ہے بلکہ یہ تو صحافیوں کو جھاڑ بھی پلا دیتے ہیں، برطانیہ میں بھی اکثر پاکستانی سیاست داں آتے رہتے ہیں اور ایسے ایسے ہیچ قسم کے بیانات دیتے اور مختلف مقامات پر بے ربط توجیحات پیش کرتے ہیں کہ ان میں سے بیشتر ''جوتوں'' کے لئے کوالیفائی کر جاتے ہیں۔ لیکن بے حوصلہ صحافی اپنے سیاست دانوں کی ایلیفکیشن بھانپتے ہوئے بھی جوتا بازی سے پرہیز کرتے ہیں اور ہم صحافیوں کی اسی کم حوصلگی کے باعث ہمارا ملک جوتا بازی کی فہرست میں بھی کسی نمبر پر نہیں آیا۔!

☆

ایک پاکستانی صحافی کا دعویٰ اس طرح ہے......

میں یہ جوتا بازی کر کے ایک تو اپنے وطن کا نام روشن کروں گا اور اگر اس وقت تک دنیا کے کسی اور ملک کے صحافی نے جوتا ماری نہ کی تو ان شاء اللہ پاکستان اس صف میں چوتھا ملک ہوگا جس کے صحافی نے کسی سیاستدان پر جوتا پھینکا ہوگا۔ اور میرا دعویٰ یہ بھی ہے کہ میرا پھینکا ہوا جوتا نشانے پر بھی ضرور لگے گا، دوسرا فائدہ ذاتی طور پر مجھے بھی ہوگا کہ میں ایک دم سے پوری دنیا میں مشہور و معروف ہو جاؤں گا، اس کے ساتھ ساتھ دنیا بھر کی جوتا انڈسٹری کو میری طرف سے کھلی آفر ہے کہ وہ میرے ساتھ معاہدہ کریں، کیونکہ جو فرم میرے ساتھ زیادہ رقم کا معاہدہ کرے گی میں اسی کا جوتا کسی سیاستدان پر پھینکوں گا۔ پھر یقیناً اس برانڈ اور اس ڈیزائن کے جوتوں کی مانگ اس قدر بڑھ جائے گی کہ کمپنی کے پاس یہ آرڈر پورا کرنے کے لئے مٹیریل اور ورکروں کی کمی ہو جائے گی، میری یہی آفر یا تجویز سگریٹ کمپنیوں، ٹوپیاں بنانے والی فرموں، چشمے، ماچسیں، جرابیں، انڈرویئر، رائٹنگ پیڈ وغیرہ بنانے والی کمپنیوں کو بھی ہے کہ وہ سنجیدگی سے اپنے مال کی مشہوری اور فوری سیل کے بارے میں غور کریں اور میرے ساتھ یا میرے جیسے ہزاروں صحافیوں کے ساتھ اس قسم کے معاہدات کریں اور اپنا سٹاک شدہ کروڑوں کا مال دنوں میں

فروخت کرنے کی ترکیب سے فائدہ اٹھائیں، لیکن جوتا کمپنیوں کے لئے یہ تجویز بہترین ہے کیونکہ کسی پر جوتا پھینکنا توہین کے زمرے میں آتا ہے، اس لئے ان سے میری گزارش ہے کہ وہ پہلی فرصت میں آگے آئیں اور اپنی قسمت کو بلندی کی طرف سے لے جائیں کہ قسمت کی دیوی بار بار در پر دستک نہیں دیتی۔ اس تجویز پر عمل کر کے انہیں بھی دو فوائد حاصل ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ وہ چند دنوں میں ارب پتی بن سکتی ہیں اور دوسرا وہ اپنے ملک کی نیک نامی کا سبب بھی ہو سکتے ہیں۔!

☆

غیر معروف صحافی برادری سے میری یہی اپیل ہے کہ وہ اپنے ارد گرد دیکھیں اور ملٹی نیشنل کمپنیوں سے اس نوع کے معاہدات کر کے اپنے حالات اور مصروفیت کا گراف اوپر کی طرف لے جائیں۔ اور ہاں تمام جوتا کمپنیوں سے میری گذارش ہے کہ میرا یہ کالم شائع ہوتے ہی براہ راست مجھ سے رابطہ قائم کریں کیونکہ کالم کی اشاعت کے فوری بعد میرے پاس معاہدات کے انبار لگ جائیں گے اور پھر میرے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہوگا کہ کس کی بولی زیادہ ہے۔ لیکن میں فرسٹ کم فرسٹ پر یقین رکھتا ہوں۔ سی بی آئی کی انکوائری، بس ذرا انتظار۔ جگدیش ٹائٹلر کا مطالبہ ہے کہ وزیر داخلہ پی چدمبرم پر جوتا پھینکے جانے کی تفتیش سی بی آئی سے کرائی جائے۔ ہندوستان کی وفاقی تفتیشی ایجنسی (سی بی آئی) صرف انتہائی سنگین جرائم کی چھان بین کرتی ہے۔ جیسے راجیو گاندھی کا قتل، بوفورس توپوں کے سودے میں دلالی یا پھر جوتے جیسے خطرناک ہتھیاروں سے وزیر داخلہ پر حملہ! یا کم سے کم جگدیش ٹائٹلر تو یہ ہی چاہتے ہیں۔ (جگدیش ٹائٹلر کانگریسی رہنما ہیں جنہیں ان الزامات کا سامنا رہا ہے کہ انیس سو چوراسی میں اندرا گاندھی کے قتل کے بعد بھڑکنے والے سکھ مخالف فسادات میں ان کا بھی ہاتھ تھا) مسٹر ٹائٹلر کا دعویٰ ہے کہ جوتا ایک سازش کے تحت پھینکا گیا جس کا مقصد لوک سبھا انتخابات کے لئے ان کا ٹکٹ کٹوانا تھا۔ ٹائٹلر صاحب تفتیش سی بی آئی سے مت کرایئے، وہ چاہے دیر سے ہی دے لوگوں کو اکثر کلین چٹ دے دیتی ہے۔ جیسے دنگوں کے سلسلے میں پچیس سال بعد آپ کو دی ہے!

☆

خوشونت سنگھ جیسے صحافی نے بھی جوتے کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور مسرت ظاہر کی ہے کہ کاش

ان پر بھی جوتے پھینکے جاتے۔ان کے مضمون سے یہ اقتباس دیکھئے :

میں پدم شری، پدم بھوشن اور پدم وبھوشن جیسے اعزاز تو لکھنے کی وجہ سے ہی پا چکا ہوں لیکن ! جرنیل سنگھ بھنڈراوالے جب پنجاب میں قہر ڈھا رہے تھے تب میں نے کچھ مضامین لکھے تھے ان میں بھنڈراوالے کو کوسا گیا تھا۔سکھوں کو چنوتی دی گئی تھی کہ اس کے خالصتان بنانے کے ارادے ناپاک ہیں۔اس نے مجھے ہٹ لسٹ میں ڈال دیا تھا۔لیکن اس کا سپاری والا مجھے مار نہیں سکا۔اسے ایک قتل کے معاملے میں پکڑ لیا گیا۔بعد میں اسے پھانسی دے دی گئی۔

بے بس مجبور اور کمزور انسان جب ظلم برداشت کرتے کرتے تھک جاتا ہے، جب اس کے صبر و ضبط کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے اور اس کی قوت برداشت انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو وہ جھنجھلاہٹ اور غصے میں انجام کی پرواہ کئے بغیر کچھ بھی کر بیٹھتا ہے۔عراق میں ظلم و ستم جبر و تشدد کے پہاڑ توڑنے والے امریکی صدر جارج بش پر جوتا پھینکا گیا۔یہ صبر و ضبط کی انتہا کے بعد ایک کمزور شخص کا دنیا کے سب سے بڑے طاقتور ملک کے سربراہ کے خلاف غصے کا اظہار تھا۔اس کے بعد ہمارے ملک میں مرکزی وزیر داخلہ پی چدمبرم پر ایک سکھ نے جوتا پھینکا۔وہ اپنی قوم پر ہونے والے ظلم و ستم سے دل برداشتہ اور ناانصافیوں سے محروم ہو کر اپنا توازن کھو بیٹھا تھا۔اس کے بعد گذشتہ روز بی جے پی کے ہی ایک سابق ضلع صدر نے بی جے پی کے وزیر اعظم بننے کی دوڑ میں شامل ایل کے اڈوانی پر چپل (کھڑاون) پھینک دیا۔مذکورہ بالا وہ معاملے (جارج بش اور چدمبرم) میں ظلم و ستم جبر و تشدد اور حق تلفی و ناانصافی کے خلاف غصے کا مظاہرہ کرتے ہوئے دو صحافیوں نے اپنی قوم کی نمائندگی کرتے ہوئے جوتا پھینکا تھا۔مگر اڈوانی پر چپل پھینکنے کا واقعہ اس لئے بھی اہم ہے کیونکہ اس میں ان کی ہی پارٹی کے سابق صدر نے غصے کا مظاہرہ یہ کہہ کر کیا کہ اڈوانی کے قول و فعل میں فرق ہے۔وہ نقلی مرد آہن ہیں، وہ ہندوتوا کے علمبردار نہیں ہیں وغیرہ۔ بہر حال وجہ کچھ بھی ہو مگر جوتا چپل پھینکنے کے واقعات صبر و ضبط کی انتہا ہے اور اپنی بے بسی، مجبوری اور کمزوری کا مظاہرہ ہے جو پوری دنیا کے انصاف پسندوں کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔لوگ اسے مذاق محسوس کر رہے ہوں گے لیکن کسی معزز یا قد آور سیاسی شخصیت پر جوتا پھینک دینا اپنے میں ایک سنسنی خیز واقعہ ہے اور ارباب اقتدار و دانشوران

کے لئے بھی لمحہ فکریہ ہے کہ وہ ایسی نوبت کیوں آنے دیتے ہیں۔ ان کے لئے موقع ہے کہ وہ اپنی اصلاح کرلیں ورنہ ابھی چند ایک نے یہ ہمت کی ہے اس کے بعد پورے ملک میں جوتے چپل چلنے لگ جائیں گے۔ کیونکہ عوام اب اپنا ذہنی توازن کھورہی ہے صبر وضبط کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔!

..............☆..............

ٹونی بلیئر پر بھی جوتوں کی بارش ہوئی تھی۔ اس کا چرچا عام ہوا تھا۔ خبر اس طرح تھی :

پچھلے دنوں برطانیہ کے سابق وزیر اعظم ٹونی بلیئر اپنی سوانح عمری، ٹونی بلیئر، ایک سفر، کی رونمائی پر کتابوں پر دستخط کرنے کے لئے ڈبلن پہنچے تو وہاں موجود مظاہرین نے ان کے خلاف مظاہرہ کیا اور ان کی گاڑی پر انڈے، جوتے اور پلاسٹک کی بوتلیں پھینکیں۔

جیسے ہی وہ ڈبلن شہر او کنل اسٹریٹ پر کتابوں کی ایک دکان پر پہنچے تو وہاں موجود تقریباً ۲۰۰ جنگ مخالف مظاہرین نے ان کے خلاف نعرہ بازی شروع کردی، تاہم پولس نے ان مظاہرین کو فاصلے پر روکے رکھا۔ مظاہرین جنہوں نے بلیئر قصائی' جیسے کتبے اٹھا رکھے تھے، عراق کے خلاف غیر قانونی جنگ میں امریکہ کا ساتھ دینے پر ان کے خلاف نعرے بلند کرتے رہے۔ ان پر پھینکا گیا کوئی بھی پلاسٹک اور کاغذ کا میزائل انہیں نہیں لگا لیکن ایک جوتا ضرور ان کی گاڑی کے سامنے والے شیشے پر چپکا رہا۔

..............☆..............

ہندوستان کے سابق وزیر اعظم من موہن سنگھ پر بھی جوتے پھینکے گئے تھے۔ اخبار میں اسے نمایاں طور پر شائع کیا گیا تھا :

ہندوستان کے شہر احمد آباد میں ایک جلسے کے دوران وزیر اعظم منموہن سنگھ پر جوتا پھینکنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وزیر اعظم منموہن سنگھ احمد آباد میں ایک انتخابی ریلی سے خطاب کر رہے تھے اور ان کی تقریر کے آغاز کے چند منٹ بعد ہی اگلی قطار میں موجود ایک شخص نے وزیر اعظم کی طرف جوتا پھینکا۔ تاہم اسٹیج اور بھیڑ کے درمیان فاصلے کی وجہ سے وہ جوتا اسٹیج تک نہ پہنچ سکا۔ تاہم وزیر اعظم کے سکیورٹی اہلکاروں نے اس شخص کو اپنی گرفت میں لے لیا اور نامعلوم مقام کی طرف لے گئے۔

☆

کشمیر میں تشدد کے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ عمر عبداللہ جب وہاں کے چیف منسٹر تھے تب یوم آزادی کی تقریب کے موقع پر احتجاجی مخالفین میں سے ایک نے ان پر جوتا پھینکا تھا جس پر عمر عبداللہ نے طنزیہ انداز میں کہا تھا کہ پتھر پھینکنے سے جوتا پھینکنا بہتر ہے۔

☆

جوتا پھینکنے کے واقعات اب بہت ہوتے رہتے ہیں۔ اس سفر کا تفصیلی جائزہ اظہار الحق قاسمی بستوی نے اس طرح لیا ہے :

جوتے کی پیدائش یقیناً حضرت انسان کی پیدائش کے ساتھ یا اس کے کچھ مابعد کی ہوگی لیکن شاید تاریخ میں لوگوں نے جوتوں کی اتنی اہمیت نہ جانی اور پہچانی ہوگی جتنی کہ موجودہ صدی میں۔ چنانچہ موجودہ دور میں حکمرانوں پر جوتا اچھالنا ہیرو بننے اور شہرت حاصل کرنے کا سب سے مختصر اور انتہائی اچھوتا طریقہ بن گیا ہے جس کو اپنانے والوں کی زیادہ تر تعداد صحافیوں کی ہے اور دوسرے میدانوں کے لوگ بھی اس حوالے سے کافی روادار ہیں۔

جوتے پھینکنے کی روایت کا آغاز اور اس کو سب سے زیادہ شہرت اس واقعہ سے ہوئی جس میں ۱۴ر دسمبر ۲۰۰۸ء میں عراق کے دورے پر آئے ہوئے تاریخ انسانی کے بدترین اور لاکھوں انسانوں کے قاتل حکمراں جونیر جارج ڈبلیو بش پر بغداد میں واقع اس وقت کے وزیر اعظم نوری المالکی کے محل میں چل رہی الوداعی پریس کانفرنس کے دوران ایک عراقی صحافی منتظر الزیدی نے بش کے اوپر پہلا جوتا اچھالتے ہوئے کہا: ”کتے! یہ عراق کے لوگوں کی طرف سے الوداعی سلام ہے“ اور دوسرا جوتا اچھالتے ہوئے کہا: ”اور یہ عراق کے مقتولین، یتیموں اور بیواؤوں کی طرف سے ہے“۔ اس گستاخی کے ردعمل کے طور پر منتظر الزیدی کو فوری گرفتار کر لیا گیا اور تقریباً نو ماہ تک قید و بند کی صعوبتوں سے گذارنے کے بعد ۱۵ر ستمبر ۲۰۰۹ء کو اسے جیل سے رہائی ملی۔

صدر بش کے ساتھ اس نام نہاد گستاخی پر منتظر الزیدی کے اس طریقۂ احتجاج نے پوری دنیا کو اپنی طرف توجہ مبذول کرائی۔ منتظر الزیدی راتوں رات مسلم دنیا کا ہیرو بن گیا اور نہ صرف مسلم دنیا کا

بلکہ دیگر مظلوم ومقہور اقوام کا بھی۔ منتظر کے بش پر پھینکے ہوئے معمولی جوتے کو خریدنے کے لئے لوگوں نے لاکھوں ڈالر روپیوں کی پیش کر ڈالی۔ اس کے احتجاج کے انداز نے پوری دنیا میں پذیرائی حاصل کی۔ چنانچہ ۲۰۰۸ء سے لے کر آج تک درجنوں، بین الاقوامی، قومی اور ریاستی لیڈران کو جوتوں کی یہ مالا پہنانے کی سعی کر کے بڑے پیانے پر لوگوں نے اپنے احتجاج کو درج کرایا اور جوتا کلب کی تاریخ میں کئی لوگوں کے نام کا خود کو حصہ بنا ڈالا۔

اس واقعے کے بعد پوری دنیا میں جوتے نے ایک عظیم مقام حاصل کر لیا۔ چناں چہ اس واقعے کے صرف ڈیڑھ مہینے کے بعد ۲رفروری ۲۰۰۹ء کو جس وقت چین کے وزیر اعظم دین جیا باد کیمبرج یونیورسٹی میں 'چین اور برطانیہ کے مابین اقتصادی تعاون اور تعلقات' کے موضوع پر لیکچر دے رہے تھے اسی وقت حاضرین میں سے ایک جرم نیشنل مارٹن جانکے نامی طالب علم نے چینی وزیر اعظم کو جھوٹا اور ڈکٹیٹر بتاتے ہوئے ان پر اپنا جوتا اچھال دیا۔ چپلوں نے بھی اپنے آپ کو جوتوں سے کم تر نہ سمجھا چنانچہ اس واقعے کے کچھ دنوں کے بعد ہی ایک اسکول کے پرنسپل نے ۱۷رمارچ ۲۰۰۹ء کو انڈین نیشنل کانگریس کے ایم پی کے امیدوار مسٹر نوین جندال کے اوپر اپنی محبوب ترین چپل اچھال کر مسٹر نوین جندال کو ایک نئی تاریخ کا حصہ بنا دیا۔ اس واردات کے گذرے ہوئے ابھی دو دو ہے ہی گذے تھے کہ ایک ہندوستانی ہندی روزنامہ کے سکھ صحافی جرنیل سنگھ نے اس وقت کے وزیر داخلہ مسٹر پی چدمبرم کے اوپر ۱۹۸۴ء کے سکھ مخالف فسادات کے حوالے سے سی بی آئی کی طرف سے ملزم جگدیش ٹیٹلر کو کلین چٹ دیئے جانے پر سوال اٹھاتے ہوئے ان پر جوتا اچھال دیا۔ جرنیل سنگھ کو گرفتار تو کر لیا گیا لیکن اس کے نتیجے میں ہندوستان کے سکھوں کا خون کھول گیا اور ملک میں ایک بار پھر احتجاج شروع ہو گیا۔ سنگھ کی رہائی کا شدت سے مطالبہ کیا گیا اور اس کے لئے سکھ برادری کی طرف سے انعامات کے اعلان کیے گئے۔ بعد میں گرچہ جرنیل سنگھ نے اپنے اس طریقہ کار پر افسوس کا اظہار کیا لیکن اس کا نام پی چدمبرم کے ساتھ ہمیشہ کے لئے ہم آغوش ہو گیا۔ اس واقعے کو بھی ابھی چند روز ہی ہوئے تھے کہ اس وقت کے اپوزیشن لیڈر راو قومی جمہوری اتحاد کی طرف سے وزارت عظمیٰ کے امیدوار اور بی جے پی کو ثری سے ثریا تک لے جانے والے سنگھی لیڈر لال کرشن اڈوانی پر ۱۶راپریل

۲۰۰۹ء کو خود انھیں کی پارٹی کے مدھیہ پردیش سے تعلق رکھنے والے ایک ناراض ممبر پواس اگروال نے ان کے ساتھ بھی جوتا ماری والی واردات انجام دی اور لعنت کا یہ طوق ان کے گلے میں ڈال کر لازوال کردیا۔ دوسری طرف اگلے دس دنوں کے بعد ۲۶ر اپریل ۲۰۰۹ء کو اس وقت کے وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ پر جس وقت وہ احمد آباد میں ایک ریلی سے خطاب کر رہے تھے ایک شخص نے آں موصوف پر جوتا اچھال کر اپنے احتجاج کا مظاہرہ کیا۔ اور پھر لگے ہاتھوں کرناٹک کے وزیر اعلیٰ مسٹر یدی یورپا کو بھی ۲۸ر اپریل کو چپل کھا کر جوتا ٹیم میں شامل ہونا پڑ گیا۔ گویا صرف چار مہینوں کے اندر پوری دنیا میں گرچہ کم لیکن ہندوستان میں جوتے کا ڈنکا بجنے لگا۔

بعد ازاں جنوری ۲۰۱۰ء میں خرطوم کے اندر جس وقت سوڈانی وزیر اعظم عمر البشیر خطاب کر رہے تھے ان پر کسی شخص نے جوتا اچھال دیا۔ جوتا کھانے والوں کی فہرست سے ترک وزیر اعظم رجب طیب اردوغان بھی اپنے کو نہ بچا سکے، چنانچہ فروری ۲۰۱۰ء میں سویلیہ میں خطاب کے دوران ایک شامی شہری کردنے یہ چیختے ہوئے جوتا پھینکا۔ ''کردستان! تو جیے ہزاروں سال''! یہ سلسلہ ملکوں اور سرحدوں کی قید سے آزاد ہر جگہ مقبول ہوتا گیا چنانچہ ۷ر اگست ۲۰۱۰ء کو پاکستان کے صدر آصف علی زرداری کی ان کے سفر برمنگھم کے دوران ایک پچاس سالہ شخص سردار خان نے جوتا نوازی کی اور صرف ایک نہیں بلکہ دونوں جوتوں سے ساتھ ساتھ قاتل ہونے کے لقب سے نواز دیا۔

ہندوستان کے کئی ایک وزرائے اعلیٰ کو بھی جوتے بازی کا سامنا کرنا پڑا ہے، چنانچہ ۱۵ر اگست ۲۰۱۰ء جو کہ ہندوستان کا یوم آزادی ہے میں ایک پولیس افسر عبد الاحد نے اس وقت کے جموں و کشمیر کے وزیر اعلیٰ عمر عبد اللہ پر جس وقت کہ وہ ایک جلسے کو خطاب کرنے جا رہے تھے جوتا پھینک کر ان کی آزادی کا جشن مکدر کر دیا۔ دوسری طرف ۴ر ستمبر ۲۰۱۰ء کو برطانیہ کے سابق وزیر اعظم ٹونی بلیر پر دو بلین، آئرلینڈ میں انڈوں اور جوتوں کی برسات ہوئی اور پھر دوبارہ ان ہی پر دو بلین میں ہی ۵ر ستمبر کو انڈوں، بوتلوں اور جوتوں کی دوبارہ بارش ہوئی۔ اور صرف ایک ہفتے کے بعد یونانی صدر جارج پاپنڈرو پر اسٹر جیوس نامی شخص کی طرف سے ۱۱ر ستمبر کو جوتا اچھالا گیا اور پھر ۲۵ر اکتوبر کو سابق آسٹریلوی وزیر اعظم جان ہاورڈ پر دو جوتے پھینکے گئے۔

سال ۲۰۱۱ء کے آغاز میں ۶ر فروری کو سابق پاکستانی صدر جنرل پرویز مشرف پر ایک خطاب کے دوران جوتے اُچھالے گئے، ۱۸ر اکتوبر ۲۰۱۱ء میں لکھنؤ کے اندز جیتندر پاٹھک نامی شخص نے مسٹر اروند کجری وال کو جوتا پھینک کے مارا لیکن وہ بچ گئے۔ اور پھر ۱۲ر دسمبر ۲۰۱۱ء کو ایس راشد نامی شخص نے ایرانی صدر محمود احمدی نجاد کو جوتے پھینک کر مارا۔ اور ان دونوں نے بھی جوتا کلب میں اپنی سیٹ بک کروالی۔ چھوٹا بڑا کوئی بھی جوتوں کے تبرک سے دامن نہیں بچا پایا چناں چہ ۲۳ر جنوری ۲۰۱۲ء کو کانگریس کے اس وقت کے جنرل سکریٹری مسٹر راہول گاندھی دہرادون میں ایک الیکشن ریلی کے دوران جوتا کھانے والوں کی فہرست میں شامل ہو گئے جب ایک شخص نے ان پر اپنا جوتا پھینکا۔

ہندوستانی وزرائے اعلی جن پر جوتے نچھاور کئے گئے ہیں ایک نام بہار کے سابق وزیر اعلیٰ جیتن رام مانجھی کا بھی ہے کہ ایک شخص نے ۵ر جنوری 2015ء کو پٹنہ میں ان پر جوتا پھنک کر مارا۔ یدی یوروپا صاحب تو اس سلسلے کے سابقین اولین میں سے ہیں اور ۹ر اپریل ۲۰۱۶ء کو دہلی کے وزیر اعلیٰ مسٹر اروند کجری وال پر وید پرتاپ کی طرف سے جوتوں سے دوسری بار حملہ کیا گیا۔

دو بار جوتا کھانے والوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے جن میں سر فہرست ایران کے سابق صدر محمود احمد نژاد، پاکستان کے سابق صدر پرویز مشرف، آسٹریلیا کے سابق صدر جان ہاورڈ وغیرہ بڑے نام ہیں۔ اس لئے کجری وال جی پر دوسری بار جوتوں کا حملہ کوئی ان ہونی یا نئی چیز نہیں ہے لہذا اس کی وجہ سے انھیں کسی طرح کی احساس کمتری میں بھی مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔ ویسے کجری وال جی اپنے ساتھ ہونے والی ان ہونیوں کی وجہ سے کافی مشہور ہیں چنانچہ ۹ر اپریل ۲۰۱۴ء میں ایک آٹو والے نے انھیں پھول پہنانے کے بہانے تھپڑ رسید کر دیا تھا جس کی وجہ سے ان کی بائیں آنکھ سوج آئی تھی اور اس سے قبل بھی ان پر انڈے، سیاہی اور موبل آئیل بھی پھینکے گئے۔

بش سے شروع اس منحوس روایت نے ان گنت لوگوں کو جوتا یا اس کی ہوا کھلا دی ہے۔ مذکورہ بالا تفصیلات میں عموماً بہت بڑے یا ہندوستانی حضرات جو جوتا بازی اور جوتا ماری کے شکار ہوئے ہیں ان کے بارے میں ایک سرسری معلومات فراہم کی گئی ہیں ورنہ تو جوتوں کا تبرک دنیا کے تمام گوشوں میں مختلف لیڈران نے وقفے وقفے سے حاصل کیا ہوا ہے۔ جس کی تفصیلات دائرۃ المعارف پر موجود ہیں۔

جوتوں کا چلن ہو جانے کی وجہ سے پوری دنیا کے لیڈران کانفرنسوں اور بھاشنوں کے درمیان ایک بار ضرور سوچتے ہوں گے کہ پرسوں بش کل کجری اور آج کہیں ان سے یہ جوتا ہم آغوش نہ ہونے لگے۔ جوتوں کی روایت کے عام ہونے کی وجہ سے لیڈران کا چاہے کوئی فائدہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو لیکن پھینکنے والوں نے اس سے بہت فائدہ اٹھایا ہے اور شاید اٹھاتے رہیں گے، لہٰذا ضرورت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اب بین الاقوامی طور پر کانفرنسوں اور جلسوں میں جوتا چپل پہن کر آنے پر پابندی عائد کی جائے یا پہن کر آنے کو مخالف وطنیت عمل قرار دیا جائے ورنہ اگلا نمبر.........کا ہے۔

..........☆..........

بش پر جوتے پھینکنے کی وجوہات کا جائزہ لیتے ہوئے سید فاضل حسین پرویز نے ایک شعر کے ذریعہ پیشن گوئی کی تھی جسے ننگی آنکھوں سے ہم دیکھ سکتے ہیں :

بغداد میں پریس کانفرنس کے دوران ایک جواں سال جاں بازٹی وی جرنلسٹ المنتظر زیدی نے سوپر پاور امریکہ کے سوپر مین پریسیڈنٹ جارج بش کو جوتے پھینک مارے اور دنیا بھر میں بسے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ مظلوم انسانوں کے جذبات کی صحیح طور سے ترجمانی کردی۔ بش تاریخ کے بدنام ترین اور قابل نفرت امریکی صدر ہیں۔ عالم انسانیت کی نفرت انہیں وراثت میں ملی ہے۔ صدام حسین حکومت کا تختہ الٹنے اور ملا محمد عمر اور اوسامہ بن لادن کی تلاش کے بہانہ اتحادی افواج نے افغانستان اور عراق میں جس بربریت کا مظاہرہ کیا اس سے شیطان بھی شرمندہ ہے۔ تیل اور گیس کے زخائر پر قبضہ کی خاطر بش نے صرف عراق اور افغانستان ہی کو نیست و نابود کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ انہوں نے خود اپنے ملک امریکہ کو معاشی بدحالی کا شکار بنادیا۔ اس بحران کے اثرات عالمی سطح پر مرتب ہوئے ہیں۔ اس طرح جارج بش صرف عراق اور افغانستان کے مجرم نہیں ہیں بلکہ سارے عالم کے مجرم ہیں۔ صدام حسین کا تختہ الٹنے اور انہیں تختہ دار پر چڑھادینے کے بعد عراقی حکومت کی تشکیل کے باوجود انہوں نے عراق سے امریکی فوج کو واپس طلب نہیں کیا۔ کیوں کہ ان کے عزائم تو کچھ اور تھے۔ المنتظر زیدی نے بش کو جوتا پھینک کر دراصل یہ دنیا کو بتا دینا چاہا کہ بش سے عراق اور عالم اسلام شدید نفرت کرتا ہے۔ زیدی کو اپنی جان کی پرواہ نہیں ہے۔ منصوبہ

بند طریقہ سے اپنے مستقبل کو سامنے رکھتے ہوئے اس نے یہ انتہائی اقدام کیا۔ مگر نہ تو بش کو اس کا اندازہ تھا اور نہ ہی زیدی کے وہم وگمان میں رہا ہوگا کہ بش پر جوتا بازی کو ساری دنیا اس قدر سراہے گی۔ دنیا نے یہ دیکھ لیا کہ عراق کے عوام کا ایک طبقہ اگر صدام حسین کو پسند نہیں کرتا تھا تو اس کی اکثریت بش سے نفرت بھی کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زیدی راتوں رات عالم عرب کا ہیرو بن گیا۔ اسے گرفتار کیا گیا اور اسے سزا بھی دی جائے گی مگر اس کے لئے عراقی حکومت کو سنگین نتائج کا سامنا کرنا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ زیدی کی گرفتاری راکھ میں دبی ہوئی چنگاری کو انقلاب کے شعلوں میں بدل دے گی۔ اور اس میں شائد امریکی افواج اور امریکہ کی ذہنی غلام عراقی حکومت بھسم ہو جائے گی۔ زیدی کا یہ اقدام دراصل نفرت اور عوامی غم وغصہ کا اظہار ہے۔ یہ اس بارش کا پہلا قطرہ ہے جو ایک عظیم طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتا ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ بش اور اس کے ہمنوا سبق حاصل کرلیں۔ بارک اوبامہ کے لئے بھی یہ ایک وارننگ ہے صدارتی عہد کا حلف لینے سے بھلے ہی وہ یہ فیصلہ کرلیں کہ عراق سے امریکی فوج کو واپس طلب کرلیا جائے۔ اوبامہ کی تائید اس لئے بھی روک دی گئی کہ عوام بش سے نالاں اور ناراض تھے۔ اوبامہ نے عراق سے متعلق سلجھی ہوئی پالیسی کا اعلان کیا تھا۔ مگر وہ انتخابی وعدہ تھا۔ جارج بش کے ساتھ بغداد میں جو کچھ ہوا اس کے بعد ان تمام قائدین کو ہوشیار ہو جانا چاہئے جو اقتدار اور عہدہ کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے انسانی اقدار کو پامال کرتے ہیں۔ زیدی نے انسانیت نوازوں کی لاج رکھ لی۔ اس نے مظلوم عوام کی جانب سے نعرہ لگایا۔ اس کا پھینکا ہوا جوتا بش کے چہرہ کو نشانہ نہ بنا سکا ہو مگر بش کی روح جس طرح سے ذلیل اور زخمی ہوئی ہوگی اس کا اندازہ کون لگا سکتا ہے۔ بش جیسے لیڈرس اس سلوک کے مستحق ہیں جس کے محاسبہ کا کوئی تصور تک نہیں کرسکتا تھا کہ ایک نوجوان نے اسے سزا دے دی۔ آفریں ہے زیدی۔

ہم اسے سلام کرتے ہیں :

یہ ابر یہاں سے اٹھے گا   اور سارے جہاں پر برسے گا

ہر کوہ گراں پہ برسے گا   ہر جوئے رواں پہ برسے گا

☆

ایک پیشن گوئی عابد معز نے بھی کی تھی۔ اس واقعہ کے پس منظر میں انہوں نے صدر بش کا نیا نام George W Bushees رکھا تھا۔ لیکن جوتا پھینکنے کو کارنامہ قرار دیا تھا:

میں اس واقعہ کو دہراتا ہوں کہ اس کی Repeat Value ہے اور وقت کے ساتھ اس کی قدر میں اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔ سبکدوش ہونے سے ۳۷ دن قبل امریکی صدر بڑی رازداری سے وداعی دورہ پر عراق پہنچے اور دارالحکومت بغداد میں وزیر اعظم نوری المالکی کے ہمراہ ایک پریس کانفرنس میں شریک تھے کہ یہ واقعہ رونما ہوا۔ ایک صحافی منتظر الزیدی نے امریکی صدر جارج ڈبلیو بش پر اپنے دوعدد جوتے پھینک مارے۔ (اسے دو ہی جوتوں پر اس لئے اکتفا کرنا پڑا کہ قدرت نے ہمیں صرف دو ٹانگیں دی ہیں۔ اس دلیر صحافی کو دو سے زائد جوتے نہ پہننے کا یقیناً افسوس رہا ہوگا)۔ پہلا جوتا پھینکتے ہوئے اس نے کہا، 'کتے، عراقی عوام کی جانب سے یہ تیرے لئے وداعی بوسہ ہے۔ اور دوسرے جوتے کو اس نے بیواؤں، یتیموں اور جنگ میں مارے گئے لوگوں کے نام معنون کرتے ہوئے نشانہ لگایا۔ وائے تقدیر۔ معزز صدر پر کئے گئے دونوں وار خالی گئے اور صدر بش نے دونوں مرتبہ اپنے آپ کو بچالیا۔

اس واقعہ نے امریکی صدر بش کی قدر و منزلت کو جہاں گھٹا دیا ہے وہیں جوتے اور اس کے لگانے والے عزت اور توقیر میں اضافہ کردیا ہے۔ منتظر الزیدی کا جوتا سب سے مقبول جوتا بن گیا ہے۔ اب یہ جوتا ہر جگہ چلتا دکھائی دیتا ہے۔ صدر بش کی تصویر پر تو وہ خوب چلتا بلکہ دوڑتا ہے۔ کبھی کبھار امریکی پرچم پر بھی وہ چل جاتا ہے۔ منتظر الزیدی کے ان جوتوں کی قیمت میں بھی بے تحاشہ اضافہ ہوا ہے (معلوم نہیں اس نے کتنے میں لیا تھا) لیکن منتظر الزیدی کے یہ قابلِ تعظیم جوتے عراقی سرکار کی تحویل میں ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ مستقبل میں انھیں کسی میوزیم میں رکھا جائے یا پھر مشہور زمانہ کرسٹی آکشنرز کے ذریعہ ان کا ہراج کیا جائے۔

قاہرہ کے ایک موچی نے بتایا کہ جوتوں سے یہ سب سے بہترین کام لیا گیا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اب تک کوئی معزز جوتوں سے پٹا ہی نہیں ہے۔ سربازار عاشقوں کی جوتوں اور چپلوں سے درگت بنتی رہتی ہے۔ مشاعروں میں پھٹے پرانے جوتے اڑتے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ

کسی لیڈر کا استقبال پہلی مرتبہ جوتوں سے کیا گیا ہے۔ لیکن امریکی صدر کے ساتھ شاید پہلی بار ایسا ہوا ہے۔ بعض لوگ جوتے پھینکنے کو بم پھینکنے سے بہتر قرار دے رہے ہیں۔ بے گناہ مارے نہیں جاتے اور گناہ گار ذلیل وخوار بھی ہوتا ہے۔ (کاش جوتے کھانے والے بھی اس بات کو سمجھ سکتے!)

چار پانچ مقامات پر سخت سیکوریٹی چیکنگ کے بعد لوگوں کو وی وی آئی پی کی محفلوں میں شریک ہونے کا موقع ملتا ہے۔ ایسے میں جوتوں کا چل جانا غور طلب مسئلہ بن گیا ہے۔ یقیناً یہ انٹیلیجنس اور سیکوریٹی کی غلطی ہے کہ یہ لوگ جوتوں کے خطرہ کا اندازہ لگانے میں ناکام رہے۔ شاید اب جوتوں کو بھی ہتھیار کی فہرست میں شامل کیا جائے! دعوت ناموں میں تحریر ہوگا کہ صرف ننگے پاؤں اور ننگے سر ہی لوگ داخلے کے اہل ہوں گے۔ اس ضمن میں پیش رفت ہوتی دکھائی دی ہے۔ امریکی صدر عراق سے افغانستان گئے اور وہاں ننگے پیر صحافیوں کو پریس کانفرنس میں بلایا گیا۔

قیاس کیا جارہا ہے کہ اس واقعہ کے بعد سے مارکیٹ میں جوتوں کے دام میں اضافہ ہوگا اور اس واقعہ کو جوتوں کی تشہیر کے لئے استعمال بھی کیا جائے گا۔ وہ کمپنی جس کے منتظر الزیدی کے شہرہ آفاق جوتے ہیں اشتہار دے گی۔ 'ہمارے جوتے امریکی صدر پر پڑ چکے ہیں' اور اس کمپنی سے مسابقت میں اشتہار آئے گا 'ہمارے جوتوں کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا'

..................☆..................

مقید خاں جوتا نوازی کے قائل ہیں۔ انہوں نے انا کی جھوٹی تسلی پر ضرب کاری کرتے ہوئے اپنی رائے پیش کی ہے :

......ہم جوتے سے سوال کرتے ہیں کہ "جوتے او جوتے" تجھے بش کے سر پر پہنچ کر کیا ملا؟ اور جوتا جواب دیتا ہے کہ "بھائی میں پہلے بھی جوتا تھا اور اب بھی جوتا ہوں۔ مجھ میں اس ترقی سے نہ کوئی نیوکلیر فرق واقع ہوا اور نہ وہ سر جھکا جس کی طرف میں پھینکا گیا۔ ہاں ان ہزاروں بلکہ لاکھوں بے بس، بے کس اور لاچار لوگوں کی انا کو کچھ جھوٹی تسلی ضرور ہوگئی کیونکہ یہ لوگ اس جنت میں جیتے ہیں جہاں غالب کو ایک ڈھونڈھنے پر ہزار ملتے ہیں۔ یہ لوگ بقا اور نمو کے راز سے ناواقف ہیں۔ جس راز کی طرف قرآن اشارہ کرتا ہے کہ اللہ اس قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جو خود اپنے آپ کو نہیں بدلتی۔ یہ

لوگ اجتماعات کر سکتے ہیں، قرار دادیں پاس کر سکتے ہیں اور احتجاج کر سکتے ہیں۔ جلوس نکال سکتے ہیں۔ یہ سب لوگ ماضی میں جیتے ہیں اور ایک ایسے مستقبل کے خواہاں ہیں جس کی تعمیر میں ان کا کوئی ہاتھ تو در کنار پرانا جوتا بھی نہیں لگا۔'' ہم نے عرض کیا وائے انقلابی جوتے (ذکر تیرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے) یہ تو بتا اس عالم بے بسی میں اگر ہم جوتا بھی نہ پھینکیں تو اور کیا کریں جب کہ اور لوگ بم اور میزائیل پھینک رہے ہیں؟ جوتے نے کہا کہ'' چاہے جوتا ہو کہ بم۔ پھینکنے کا حق اسی کا ہے جو بنانے کی بھی صلاحیت رکھتا ہو۔ تم نہ جوتا بنا سکتے ہو نہ بم۔ تم اپنے در و دیوار ہی نہیں اپنے دل و دماغ میں بھی جھانک کر دیکھو کچھ بھی تمہارا نہیں ہے۔ حتیٰ کہ وہ بینائی بھی۔ کیونکہ تم دیکھ بھی وہی سکتے ہو جو تمہیں دکھایا جاتا ہے۔ دور کیوں جاتے ہو بتاؤ تو سہی اس جدہ شہر میں اپنی شاموں کو کسی نہ کسی کے نام معنون کرنے کے علاوہ تمہارے پاس کوئی اور خالص علمی، ادبی و دانشورانہ محفلوں کا باضابطہ اہتمام ہوتا ہے؟ کیا کوئی Think tank ہے جہاں سے جہاں بانی کے سوتے پھوٹتے ہیں؟...... بھائی میں تو صرف ایک جوتا ہوں میں کیا اور میری اوقات کیا؟ پاؤں میں رہنا میری تقدیر ہے لیکن جب ایک بار تقدیر کے فلسفے سے باہر نکل کر تدبیر کے ہاتھوں آیا تو میرا مقام بلند ہو گیا۔

اٹھو اور اپنی شاموں کو جوتوں کے ہی نہیں بلکہ اپنے مستقبل کے بھی نام کرو۔

..........☆..........

حقائق کی روشنی میں علیم خاں فلکی مشورہ دیتے ہیں اور تنبیہ بھی کرتے ہیں :

......بش کی شرافت ہے کہ اس نے جاتے جاتے یہ تو بتا دیا کہ اس کو دس نمبر کا نہیں کوئی اور نمبر کا جوتا چاہئے تھا جو مسلمانوں کے پاس نہیں ہے۔ خیر زیدی کو بش کے مخالفین نے ہی نہیں بلکہ اس کے حمایتیوں نے بھی بھرپور دادِ شجاعت دی۔ ایک مصری نے بیٹی، ایک کویتی نے مرسیڈس کار اور ایک سعودی نے دو ملین ریال کا آفر کیا ہے۔ جاپانیوں نے بش کے جوتے کھانے کے ایک گھنٹے کے اندر ہی کمپیوٹر گیم بنا کر زیدی کا ادھورا خواب پورا کر دیا اور لاکھوں زیدی کمپیوٹر پر بش کو جوتے مار مار کر اپنے بھی ارمان پورے کرنے لگے۔ حیدر آباد کے ایک نوجوان نے بھی مسلم پرسنل لا کی مخالفت میں اٹھنے والے چند مسلمان لیڈروں کو بھی جب جوتوں کا ہار پہنایا تھا اس کے بعد سے آج تک کسی نے

مسلم پرسنل لا کی مخالفت یا یونیفارم سیول کوڈ کی حمایت میں بولنے کی ہمت نہیں کی۔ لیکن یہ یاد رہے کہ ایک جوتا دشمن کی ساکھ کو دھکہ ضرور لگا سکتا ہے لیکن قوموں کی تقدیر نہیں بدل سکتا۔ وقتی طور پر ایسے زیدی تو پیدا ہوتے رہیں گے اور اپنی حمیتِ قومی کا ثبوت دیتے رہیں گے لیکن نہ ہر شخص زیدی بن سکتا ہے نہ ہر ایک کے سامنے بش آسکتا ہے۔ اگر زیدی جیسی ہمت، حوصلہ اور ارمان اپنے دلوں میں پاتے ہو تو اپنے اس حوصلے کو استعمال کرنے کے امکانات پر غور کرو۔ جوتے سے کہیں زیادہ طاقتور ہتھیار اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو عطا کیا ہے۔ اپنا قیمتی وقت، جوانی کی صلاحیتیں اور مال اگر صحیح استعمال کرنے کا ہر نوجوان عزم کرلے تو آج قوم بدل سکتی ہے۔ ورنہ وقت وہ جوتے ہم پر بسائے گا کہ ہم جوتوں میں دفن ہو جائیں گے۔

..................☆..................
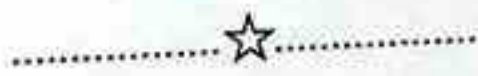
نادر خاں سَر گروہ نے جوتے کے سلسلے میں چند محاوروں کو استعمال کرنے کی کوشش کی ہے:

ہم نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ جوتوں پر کچھ لکھیں گے۔ اور بے حمیت سیاست دانوں کو پڑنے کے بعد تو جوتے اس قابل ہی نہیں رہے کہ اُن پر کچھ لکھا جائے۔

لیکن بُش کو جوتے پڑنے کے بعد ہمارے پیٹ میں بھی ''جوتے دوڑنے لگے''۔ چار و ناچار ہمیں بھی جوتوں کی شان میں قصیدہ پڑھنے کا قصد کرنا پڑا۔

یوں تو...... اب سے پہلے بھی بے شمار سیاست دانوں کی شہرت میں جوتوں سے چار چاند لگے ہیں۔ لیکن بُش پر ہوئی جوتوں کی ''غلہ باری'' کو میڈیا اور ادبی حلقوں نے عراق پر ہوئی ''گولہ باری'' سے زیادہ اُچھالا۔ ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ کسی صحافی نے کسی کی ''جوتوں سے خبر لی ہو''۔ اُس صحافی نے سابق امریکی صدر بش پر جوتے اُچھال کر، شعراء اور ادباء کی طرف ایک نیا موضوع اچھال دیا۔ پھر سب نے جوتوں کو ''ہاتھوں ہاتھ لیا'' اور اس کے بعد ''سر پر اُٹھا لیا''۔ جہاں دیکھو جہاں ''جوتے اُڑائے جا رہے ہیں''۔ اب تو حال یہ ہے کہ ''جوتوں کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے ہیں''۔ ہر قلم کار ہاتھ کا کام طاق پر رکھ کر جوتوں کے پیچھے ''ہاتھ پاؤں دھو کر پڑ گیا ہے۔'' اپنی دانست میں سب لکھنے والے کاغذ پر جوتے چلا کر ایسے خوش ہیں گویا اُنھوں نے ہی بُش پر جوتے چلائے ہوں۔ اُن کی خوشی

عراقی صحافی سے کچھ زیادہ ہی معلوم ہوتی ہے۔اُس صحافی کوتو اپنے چرمی جوتوں سے ہاتھ دھونا پڑا اور ......امریکی فوج کی گرفت میں آکر اپنی کھال سے۔جبکہ شعراء اور ادباء جوتے چلا چلا کر داد بٹور رہے ہیں اور اپنی کھال میں پھولے نہیں سما رہے۔

جوتے کی تو اپنی کوئی حیثیت نہیں ہوتی لیکن اس کے پہننے سے...... پہننے والے کی حیثیت کا تعین ہوتا ہے۔کبھی کبھار شخصیت کے سبب جوتے کی قیمت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ایسا دونوں صورتوں میں ہوتا ہے۔یعنی......جوتا پیر میں ہوتب بھی......اور سر پر ہوتب بھی۔کہتے ہیں کہ کسی کی اوقات دیکھنا ہوتو اُس کے جوتے دیکھو۔اور کسی کو اس کی اوقات دکھانا ہوتو......اُس کو ''جوتا دکھاؤ۔''

ہمارے دوست پُر جوش پوری کہتے ہیں کہ......جوتوں کی اہمیت کا اندازہ ہمیں اپنی شادی کے موقع پر ہوا تھا جب ہم پہلی مرتبہ ''بن ٹھن'' کر سسرال گئے تھے۔وہاں ہم نے دیکھا کہ سسرال والوں کی نظر ہم سے زیادہ ہمارے جوتوں پر تھی۔اُس وقت ہمیں اپنی اور جوتوں کی اوقات کا فرق صاف نظر آیا تھا۔

ہمارے محلے میں ایک ریٹائرڈ فوجی رہتے تھے۔اُن کی جوتیاں الگ طرح کی ہوتی تھیں۔سامنے سے بل کھائی ہوئی۔پھر اوپر کو مڑی ہوئی۔بالکل اُن کی مونچھوں کی طرح دائیں اور بائیں پیچ کھائی ہوئی۔آپ انھیں ''پیچیدہ'' مونچھیں بھی کہہ سکتے ہیں۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُنھوں نے دو چھوٹی چھوٹی جوتیاں اپنے منھ پر ٹکائی ہوں۔وہ سب کو ''مونچھوں کی نوک پر مارتے تھے۔'' جب ہم چھوٹے تھے تو انھیں دیکھ کر اِدھر اُدھر ہو جاتے تھے کہ وہ ہمیں پیار سے چومتے کم تھے اور ''مونچھتے'' زیادہ تھے۔

ہم نے پُر جوش پوری سے کہا کہ ''اگر ہم اُس صحافی کے جوتوں میں ہوتے (If I were in his shoes) تو ملٹری شوز (Military Shoes) میں ہوتے۔جس کے نیچے موٹی سی گھوڑے کی نعل بندھی ہوتی۔اور پھر......''۔''ملٹری شوز کی بات کرتے ہو!'' پُر جوش پوری نے ہماری بات کاٹتے ہوئے کہا ''پہلے وہ جوتا تم سے اُٹھ پاتا،تب نا چل پاتے''!

''ہم اگر اُس کی جگہ ہوتے'' پُر جوش پوری نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ''ہم اُس

کی جگہ ہوتے تو ایک منصوبہ کے تحت جوتوں کی بوری لے جاتے ......اور اُنھیں دونوں ہاتھوں سے لٹاتے اور سب فتنہ گردوں کو یہ دکھا دیتے کہ......ہم جوتے بیچ کر سو نہیں رہے ہیں۔''

ہم نے اور پُر جوش پوری نے ایک نئی جہت میں سوچنا شروع کیا تو......ہم پر یہ آشکار ہوا کہ...... ہر آدمی کو جوتے چلانے کی مشق کرنی چاہیے۔ نہ معلوم کب ضرورت پڑ جائے اور نا تجربہ کاری کے سبب نشانہ چوک جائے۔ اس کے لئے ہم نے یہ طریقہ ڈھونڈ نکالا کہ آپ اپنی فراغت کی مصروفیت میں سے تھوڑا سا وقت نکال کر اپنے گھر کی کسی دیوار پر اپنے علاقے کے کسی ناکارہ سیاسی لیڈر کی تصویر چسپاں کر دیں۔ پھر ایک فاصلے پر چند پُرانے اور کٹے پھٹے جوتے لے کر کھڑے ہو جائیں۔ لیکن اپنے ہدف پر نشانہ سادھنے سے پہلے وہ تمام مسائل جن سے آپ دو چار ہیں، ذہن میں دہرائیں......مثلاً، مہنگائی، لوڈشیڈنگ، خستہ حال سڑکیں ایک لمبی فہرست سے جو یقیناً آپ کو ازبر ہوگی۔ جتنا زیادہ کرب ہوگا اور جتنا شدید غصہ ہوگا۔ جوتا مارنے میں اُتنا ہی لطف آئے گا، اُتنی ہی راحت ملے گی۔ لیکن غصہ ایک حد تک قابو میں ہونا چاہیے ورنہ اُس کے زیر اثر نشانہ خطا بھی ہو سکتا ہے۔ اور یاد رہے کہ جوتا چلاتے وقت تصویر میں موجود سیاسی لیڈر معصوم بن کر آپ کو اپنا ارادہ بدلنے پر مجبور نہ کر دے۔ جذبات کو قابو میں رکھئے ورنہ خود آپ بلڈ پریشر کا نشانہ بن سکتے ہیں اور آپ اُن جوتوں سے اپنا ہی سَر نہ پیٹ لیں۔

ہماری ان باتوں کا جب ہمارا کلون (Clone) پلازر کو علم ہوا تو وہ...... ہمیشہ کی طرح جذباتی ہو گئے اور کہا :

''کیا ہوگا ان سب باتوں سے؟ بہت خوش ہیں آپ ایک طاقت ور ملک کے صدر پر جوتے اُچھال کر۔ فلسطینی گزشتہ نصف صدی سے اسرائیلی فوجیوں اور ٹینکروں پر پتھر اُچھال رہے ہیں۔ کیا اب اپنے گھر میں بے گھر عراقی باشندے قابض افواج کو جوتوں سے جواب دیں گے؟ کیا اکیسویں صدی میں ہم اپنا دفاع پتھر کے دور کے ہتھیاروں سے کریں گے؟ کیا ایسے بے اثر ردعمل سے مسائل کا حل نکل آئے گا؟ وہ جس نے جوتے چلائے......ذرا خود کو اُس کی جگہ رکھ کر دیکھئے۔ بحیثیت عراقی اور ایک صحافی اُس کی آنکھوں نے کیسے کیسے دل دہلا دینے والے مناظر دیکھے ہوں گے۔ سہمی ہوئی

آنکھوں میں ٹھہرے ہوئے مستقبل دیکھے ہوں گے۔ سنگ دل فوجوں کے جوتوں کی ٹھوکر میں اپنوں کے سر دیکھے ہوں گے۔ اپنے ہم وطنوں کے بے حس و حرکت جسموں پر ظلم کی تحریریں پڑھی ہوں گی۔ جانے کتنے جنازوں کو خون کے غسل کے بعد خون کے ہی کفن میں دفناتے دیکھا ہوگا۔ معصوموں کی آہ و بکا سنی ہوگی۔ موت کی نیند سو رہے بچوں کو جھنجھوڑ کر جگاتی، روتی بلکتی مائیں دیکھی ہوں گی۔ عصمتوں کے پردے چاک ہوتے دیکھے ہوں گے۔ گھٹنوں میں سر دیئے، گزرے ہوئے لمحوں کو کوستی، زندگی کی قید سے آزاد ہوتے کوستی، کچھ نوچی گئیں زندہ لاشیں دیکھی ہوں گی۔

یقیناً وہ جوتے چلا کر خوش نہیں ہوا ہوگا۔ وہ سو جوتے چلا کر بھی خوش نہیں ہوتا۔ پورا عراق مل کر بھی جوتے چلا لے، تب بھی کچھ نہیں بدلے گا۔

پریس کانفرنس میں جوتے پھینکے جانے کے واقعہ کی تہہ میں...... اُس کڑوے سچ کو نہ دبایئے۔ ورنہ ہمارے مسائل پر "خوش فہمی" اور "بے حسی" کے خول چڑھتے جائیں گے اور ہم اپنی بے بسی کا اظہار بھی نہ کر پائیں گے۔ جوتے چلا کر بھی نہیں...... اپنے سَر پیٹ کر بھی نہیں۔"

..............☆..............

نیاز احمد آسی نے تاریخی جائزے کے ساتھ جوتے کی وقت نظری پر روشنی ڈالی ہے:

ہر جوتے کی قسمت اور قیمت الگ الگ ہوتی ہے۔ کچھ جوتے معمولی، کچھ غیر معمولی لوگوں کے پیروں کی شان بڑھاتے ہیں۔ جوتا کیا حقیر کیا فقیر، کیا نیتا کیا بابو، سب کے پیروں کی زینت بنتے ہیں۔ جوتے کی کوئی برادری نہیں ہوتی ہے۔ اور نہ ہی اس کا کوئی مسلک ہوتا ہے۔ اسے سیکولرسٹ، کمیونسٹ سارے لوگ پہنتے ہیں۔ عورت ہو یا مرد، ایشیائی ہو یا یورپی سبھی اسے پہن کر اٹھلاتے ہیں۔ پجاری ہو یا مولوی سارے لوگ اسے پہننا باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ جوتے سے کسی کی دشمنی نہیں یہ سب کو اپنا دوست بناتا ہے۔ جوتوں کے دربار میں نہ کوئی خان ہوتا ہے نہ انصاری، نہ کوئی اشراف ہوتا ہے نہ ارزال، نہ کوئی شودر ہوتا ہے نہ برہمن، جوتا سب کی خدمت کرتا ہے اور اپنی بے چارگی اور بے عزتی پر آنسو بہاتا ہے۔ کہا جاتا ہے سرسید احمد خاں نے "جوتے" کی بدولت ہی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بنائی تھی۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ مشہور ہے کہ نواب حیدر آباد نے سرسید احمد کو چندے کے

طور پر ایک جوتا عنایت فرمایا تھا۔ سر سید نے اس جوتے کو موچی کے ہاتھ فروخت کر کے جوتے کی رقم کی رسید نواب کو بھجوادی تھی۔ نواب حیدر آباد اس واقعہ سے اتنا شرمندہ ہوا کہ اس نے سر سید کے اس کار خیر کے لئے سالانہ عطیہ مقرر کردیا۔ بہر حال جوتا ہما شما، کالا، گورا ہر رنگ و نسل کے لوگ پہنتے ہیں۔

جوتے کی صرف ایک زبان ہوتی ہے۔ جو صرف اور صرف پیروں کے لئے ہوتی ہے۔ اسے شریف ہی نہیں بدمعاش بھی پہنتے ہیں۔ اس کی قسمت میں ناہموار راستوں پر رگڑ کھانا، کیچڑوں اور غلاظتوں کو منھ لگانا ہی لکھا ہوتا ہے۔ ریگزاروں، پہاڑوں اور کانٹوں بھرے راستوں میں اسے بار بار لہولہان ہونا پڑتا ہے۔ اسے بے ایمان لیڈر سے لے کر کرپٹ سرکاری افسران تک پہنتے ہیں۔ غدّار وطن سے لے کر وفادار تک سارے لوگوں کے پاؤں کی زینت بن کر اپنی تذلیل برداشت کرنا اس کی تقدیر ہے۔

مگر جوتا تو جوتا ہوتا ہے۔ یہ کبھی سر چڑھ کر نہیں بولتا ہے۔ مگر 14 دسمبر 2008 کو دنیا کے لاکھوں کروڑوں لوگ امریکہ کے صدر جونیر بش کے سر پر المنتظر زیدی کے جوتوں کو سر چڑھ کر بولتے ہوئے دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔ تب دنیا کو پہلی بار جوتے کی طاقت، حیثیت اور قدر و قیمت کا اندازہ ہوا۔

خبر کے مطابق المنتظر زیدی کے اس جوتے کی قیمت ایک سعودی شہزادے نے 50 کروڑ روپے طے کردی ہے۔ 50 کروڑ کی یہ رقم ہندوستان جیسے ایٹمی پاور ملک کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی ہے۔

50 کروڑ روپے تو ہر ماہ ہمارے ملک کو فوج کی "دیکھ ریکھ" پر خرچ کرنا پڑتا ہے۔ ہاں 50 کروڑ کی یہ رقم 50 کروڑ کی اس آبادی کے لئے ضرور موٹی رقم ہوسکتی ہے جو رات بغیر کھائے سو جاتی ہے۔ 50 کروڑ کی یہ رقم ان ہزاروں لوگوں کی جان ضرور بچا سکتی ہے جو بغیر دوا کے روزانہ مر جاتے ہیں۔ 50 کروڑ کی یہ رقم ہر تین سال میں ایک لاکھ کسانوں کو خودکشی سے روک سکتی ہے۔ ایسے لوگ اگر جوتے کی قسمت پر رشک کریں تو کیا تعجب ہے؟...... کہا جاتا ہے جوتے کی تاریخ انتہائی قدیم ہے۔ جوتے کی ایجاد میسوپوٹامیہ میں ہوئی جو عراق کا قدیم نام ہے۔ اس وقت دائیں اور بائیں پیر کا جوتا ایک جیسا ہی ہوتا تھا۔ اور پہلی بار دائیں اور بائیں پیر کے جوتے بنائے گئے چودھویں صدی عیسوی میں۔

جوتے کی بناوٹ اور سجاوٹ میں مزید نکھار کے ساتھ ساتھ عورتوں اور مردوں کے لئے الگ الگ جوتے اور جوتیوں کی ایجاد ہوئی تھی۔ سترہویں صدی میں جوتے بنانے کے لئے Massa

Chusetts میں کارخانے کھولے گئے۔ انیسویں صدی میں ایسے کارخانے وجود میں آئے جو کم وقت میں زیادہ تعداد میں قیمتی جوتے اور جوتیاں مشینوں کے ذریعہ تیار کرتے تھے۔ اس طرح عراق کے ایجاد کردہ جوتے کو مغربی قوموں نے تحقیق کے دائرے میں لاکر جوتے کے متعدد کارخانے قائم کئے۔ مثلاً کناڈا کی Bata امریکہ کی Wood Land اور Rebok کمپنیاں وغیرہ۔ مگر فی الوقت جوتے کی عالمی منڈی میں عراق کے المنتظر اینڈ کمپنی کے جوتوں نے دھوم مچادی ہے۔

جوتے کے بارے میں عمومی رائے یہ ہے کہ جوتا آدمی کی شان اور وقار بڑھاتا ہے۔ مگر کچھ دانشور حضرات اس سے اختلاف رکھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ جوتے سے آدمی کی شان نہیں بڑھتی ہے بلکہ آدمی سے جوتے کی شان بڑھتی ہے۔ ہاں مگر یہ جوتے جوتے اور آدمی آدمی پر منحصر کرتا ہے۔

جوتے کیا کیا گل کھلاتے ہیں ذرا آپ بھی ملاحظہ فرمائیں :

میرے ایک دیرینہ رفیق جب کل مجھ سے ملے تو انہوں نے بڑی افسردگی سے بتایا کہ نیاز! بھائی یہ جوتا میرے اہل وعیال کے اعصاب پر بُری طرح سوار ہو گیا ہے۔ جب ذرا راشن گھٹتا ہے ...... یا بیوی کو کوئی تکلیف ہوتی ہے تو جھٹ کہتی ہے...... آپ سے تو اچھا المنتظر زیدی کا جوتا ہے...... حد تو یہ ہے کہ آج میرے بیٹے نے اسکول کی فیس نہیں دینے پر یہی بات کہہ دی......

مشہور مجاہد آزادی، سابق وزیر اعلیٰ بنگال سدھارت رائے شنکر کے نانا چترنجن داس ایک ٹرین کے فرسٹ کلاس میں سفر کر رہے تھے۔ ساتھ میں ایک انگریز بھی سفر کر رہا تھا۔ اس انگریز نے چترنجن داس کی چھتری کو اٹھا کر ٹرین سے باہر پھینک دیا اور لیٹ گیا۔ چترنجن داس نے انگریز کے جوتے کو اٹھا کر باہر پھینک دیا اور لیٹ گیا۔ کچھ دیر کے بعد انگریز اپنے جوتے تلاش کرنے لگا۔ اس دوران اس نے چترنجن داس سے پوچھا...... کیا تم نے ہمارے جوتے کو دیکھا ہے؟ چترنجن داس کا جواب تھا ...... ''تمہارا جوتا ہماری چھتری کو لانے کے لئے گیا ہے۔''

مشہور شاعر مجاز لکھنوی ایک جوتے کی دکان میں تشریف لے گئے۔ دکاندار نے بہت سارے جوتے سامنے لاکر رکھ دیے۔ لیکن مجاز لکھنوی کو جوتے پسند نہ آئے۔ آخر کار دکاندار نے مجاز سے مخاطب ہو کر کہا...... ''جناب! اتنے جوتے پڑے ہیں پھر بھی طبیعت نہیں بھری۔'' مجاز فوراً سمجھ گئے۔

اس کے بعد مجاز جوتے پاؤں میں ڈال کر بولے...... ''ساٹھ روپے لیتے ہو یا اُتاروں جوتے۔''

پچھلے دنوں عراق کے صحافی المنتظر زیدی نے آزادی کے نام پر 30 لاکھ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنے والے امریکی صدر کے سر پر جوتے چلا کر صحافیوں کو ایک نئی راہ دکھائی ہے۔ اور قلم کی سادگی کو خیر باد کہتے ہوئے جوتوں کی نوک سے ایک نئی تاریخ لکھ دی۔

اب صحافت چھوڑیے جوتے چلانا سیکھیے

ہو سکے تو آپ بھی المنتظر بن جایئے

☆
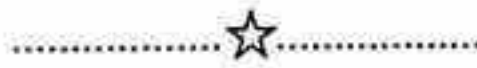
ایک کارٹون کے ذریعہ بھی جوتا کے فکر و عمل کو نمایاں کیا گیا ہے :

جوتا اردو ادب کا خاص موضوع بن گیا ہے۔ شاعری اور مضامین کے علاوہ انشائیے بھی لکھے گئے ہیں جن میں ناانصافیوں اور سازشوں کے خلاف آواز بلند کی گئی ہے اور بہترین ردعمل کا اظہار کیا گیا ہے۔ آشنا حقیقت کی جستجو کی مثال دیکھیے۔ زنفر کھوکھر نے اضافی خطرے کی تشویش ظاہر کی ہے:

جوتے کی اہمیت سے کسے انکار ہے۔ جوتا، دکھ سکھ میں ہمیشہ انسان کا ساتھی اور ہم نوا رہا ہے۔ انسان ننگے سر رہ سکتا ہے اور اکثر ننگے سر ہی رہتا ہے مگر ننگے پاؤں کبھی نہیں رہتا ہے۔ سوائے کسی خاص موقعہ یا مالی مجبوری کے۔

جس طرح پگڑی سر کے لئے عزت کا مقام رکھتی ہے، اسی طرح جوتا پاؤں کی عزت اور آبرو ہوتا ہے۔ پاؤں کو کانٹا لگنے سے بچاتا ہے۔ ٹھوکر لگنے سے بچاتا ہے۔ پاؤں کو خوبصورتی بخشتا ہے۔ صرف یہی نہیں پاؤں کے عیب و نقص بھی چھپاتا ہے۔ اگر جوتا ایجاد نہیں ہوا ہوتا تو یقین مانئے پاؤں کی موجودہ خوبصورتی اور شکل و صورت ہرگز ایسی نہیں ہوتی۔

ایک فنکار کے ہاتھوں، کڑی محنت اور تراش خراش کے بعد بن سنور کر جوتا جب پاؤں میں فٹ بیٹھتا ہے تو وہ انسان کی شخصیت کا ایک خاص حصہ بن جاتا ہے۔ جس طرح لباس کے لحاظ سے انسان کی شخصیت کا جائزہ لیا جا سکتا ہے اسی طرح جوتے کے انتخاب میں بھی انسان کی شخصیت کا بڑا دخل ہوتا ہے۔

جوتے کا حلقۂ کاروبار بھی بہت وسیع ہے۔ جوتا قد بڑھانے میں معاون اور مددگار ثابت ہوتا ہے۔ کسی سے کوئی کام پڑ جائے تو جوتے گھسا کر کام نکالا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں ناچنے نچانے اور دوڑ بھاگ کرنے میں بھی جوتا اہم رول ادا کرتا ہے۔ غرض یہ کہ جوتا ہر دور میں اور ہر طرح سے انسان کا معاون اور مددگار رہا ہے۔

دال کے برتن کم پڑ جائیں تو جوتوں میں دال بانٹی جا سکتی ہے۔ کسی سے ان بن ہو جائے تو اسے جوتے کی نوک پر ٹکایا جا سکتا ہے۔ توبہ تائب کرنے کے لئے جوتے پر ناک رگڑی اور گڑائی جا سکتی ہے۔ اگر کسی کی شہرت میں خاطر خواہ اضافہ کرنا مقصود ہو تو اس کی پگڑی اچھالنے کے بجائے اس پر جوتا بہ آسانی اُچھالا جا سکتا ہے۔

ہاں! جوتے اور سر کا چولی دامن کا ساتھ کبھی نہیں رہا ہے۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایک دوسرے سے الگ الگ مقام رکھنے اور اپنے اپنے مقام پر ڈٹے رہنے کے باوجود کسی وسیلے سے دونوں کا آپسی رابطہ بحال ہی رہا ہے۔

کبھی کبھی سر کی ٹوپی، چادر یا پگڑی وغیرہ کسی دوسرے کے پاؤں میں ڈال کر اپنی بات منوالی جاتی ہے یا بگڑتی بات کو درست کر لیا جاتا ہے۔ اس طرح کے فعل میں عاجزی، حلیمی اور معذرت شامل ہوتی ہے۔ اور دوسرا شخص چاہے کتنا ہی بڑا یا مغرور کیوں نہ ہو وہ سر کا احترام کرتے ہوئے دوسرے کی بات تسلیم کر لیتا ہے۔ مگر پاؤں کا جوتا جب سر تک جا پہنچتا ہے تو اس کا انداز دیگر ہوتا ہے۔ بلکہ ٹوپی، چادر اور پگڑی وغیرہ کے بالکل ہی برعکس ہوتا ہے۔

بعض داناؤں کے خیال میں کسی کو جوتا دکھانا ایک مشکل کام ہے۔ کسی کے لئے جوتا اٹھانا یا اچھالنا اور بھی مشکل کام ہے۔ اور کسی کے ٹھیک سر تک جوتے کو پہنچانا تو نہایت ہی مشکل اور کٹھن ہوتا ہے۔ لیکن انسان، انسان ہے اور وہ ہر مشکل کام سرانجام دے بیٹھتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جوتے کا وار سب سے بڑا ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ بندوق کی گولی، توپ کے گولے، میزائیل، ہوائی بمباری اور بم دھماکے سے بھی زیادہ خطرناک اور نقصان دہ ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی گولی، گولے، بمباری اور بم دھماکے وغیرہ کے وار سے بچ جائے تو وہ خوش قسمت کہلاتا ہے۔ اس کی قدر و قیمت اور اہمیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسے وی آئی پی کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اور اس کی سیکورٹی بڑھا دی جاتی ہے اور بدقسمتی سے اگر مر جائے تو شہید کہلاتا ہے۔

مگر جوتے کا وار...... ! یہ وار اس وقت اور شدید ہو جاتا ہے جب کسی چھوٹے شخص کے وسیلے سے جوتا ایک بڑے شخص کے سر تک جا پہنچتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جوتے کا وار نشانے پر بیٹھ جائے یا نشانہ چوک جائے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ کیونکہ ہر دو صورت میں اس کا خاطر خواہ نتیجہ اٹھتا ہے۔

ویسے جوتے سے وار کرنے کا مطلب کسی کو جان سے مارنا ہرگز نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ اسے ایسی کیفیت میں مبتلا کرنا ہوتا ہے کہ وہ جی سکے اور نہ ہی مر سکے اور ساتھ ہی ساتھ اسے شہرت دوام بھی حاصل ہو جائے۔

آج کے ترقی یافتہ دور میں جوتے نے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ وہ کسی سے کم اور پیچھے نہیں ہے بلکہ ایک ہتھیار ہے اور ایک بولتی طاقت ہے۔ بطور طاقت جوتے نے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ وہ اونچی سے اونچی اُڑان بھر سکتا ہے اور بڑی سے بڑی شخصیت کے سر تک جا پہنچنے کا دم خم اپنے اندر محفوظ اور موجود رکھتا ہے اور وہ ایک سیوسائڈ بمبر سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

بہر حال جوتے کی اس اہمیت اور کارکردگی سے دنیا کو ایک اضافی خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اب کوئی بھی کانفرنس، کوئی بھی جلسہ یا اجتماع جوتے کے خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ بھلا کوئی کہاں تک اس چھپے رستم پر نظر رکھ سکتا ہے۔

جوتے کی کارکردگی کے مدنظر اب وہ دن دور نہیں کہ سیکورٹی کے نام پر جوتے اتروا کر ہی لوگوں کو وی آئی پیز کی میٹنگ میں جانے کی اجازت دی جائے۔

صرف یہی نہیں جوتے نے کھیل کے میدان میں بھی اپنا بھرپور حصہ ڈالا ہے۔ حال ہی میں انٹرنیٹ پر جوتے سے نشانہ ہٹ کرنے کا کھیل دنیا کا سب سے زیادہ پسندیدہ کھیل بن کر ظاہر ہوا ہے۔ اس کھیل کے وجود میں آتے ہی کروڑوں لوگ اسے کھیلنے میں جٹ گئے اور لاکھوں کامیاب بھی ہوئے۔ اس کھیل کی پسندیدگی اور کامیابی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب وہ دن دور نہیں جب کرکٹ پر جوتے کو فوقیت حاصل ہو جائے گی کیونکہ...... ہنگ لگے نہ پھٹکری ...... کے مصداق اس کھیل میں جوتے کا پرانا یا نیا ہونا ضروری نہیں بس جوتا ہونا ہی کافی ہے۔ جوتے کی اہمیت اور کارکردگی کے مدنظر اس کے لئے ایک پنتھ دو کاج کے بجائے ایک پنتھ اور سو کاج بلا جھجک کہا جا سکتا ہے۔

..................☆..................

لندن کے امجد اسلام امجد جوتے کی دخل اندازی کو اس طرح اجاگر کرتے ہیں :

جب سے انسان کا وجود ظہور میں آیا جوتے بھی تبھی سے ایجاد ہوئے، پتھریلی اور خاردار زمین نے اسے سوچنے پر مجبور کیا ہوگا کہ تن ڈھانپنے کے ساتھ ساتھ پاؤں ڈھانپنا بھی ناگزیر ہے۔ زمانہ جاہلیت سے لے کر آج کے عروج زمانہ کو دیکھ لیں تو تن ڈھانپنے سے زیادہ پاؤں ڈھانپنے کا خیال زیادہ کیا جاتا ہے، ادھر مغرب والوں نے جہاں لباس کو گھٹنوں سے اوپر کر دیا وہاں جوتوں کو بھی ٹخنوں

سے بڑھا کر گھٹنوں تک لے آئے ہیں۔

جوتوں کا دخل انسانی زندگی میں اس قدر اہم ہے کہ ان کے بغیر اس کی تکمیل نامکمل نظر آتی ہے۔ بچے بوڑھے جوان مرد عورت سب کے لئے جوتوں کا ہونا ناگزیر ہے۔

انسان وہ واحد جاندار ہے جو بچپن سے لے کر مرنے تک جوتیاں پہنتا ہے، کھاتا بھی رہتا ہے۔ زمانہ تعلیم سے لے کر کاروباری زندگی، سیاسی زندگی اور ازدواجی زندگی تک کبھی استادوں سے، کبھی ماں باپ اور بڑے بھائیوں سے، کبھی پڑوسیوں اور محلّہ داروں اور کبھی پوری قوم سے محاورتاً بھی اور عملی بھی جوتے کھاتا رہتا ہے۔ کئی تو ایسے زندہ دل بھی دیکھے ہیں جو سرِ بازار کسی حسینہ سے جوتے کھا کے مثال قائم کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو پارلیمنٹ میں بھی اس کا استعمال بڑی فراخدلی سے کیا جاتا ہے اور جس لیڈر کو ایک بار جوتے پڑتے ہیں اگلی بار عوام اسے پھر چن لیتی ہے۔ ایک بار جس لیڈر کو جوتوں کے ہار پہنا کر کرسی سے اتارا جاتا ہے اسی کی جگہ آنے والے کو جوتے کھلا کر پھر پہلے لیڈر کو کرسی پیش کی جاتی ہے۔ اس طرح ہر آنے والے کے سر پر جوتا لٹکا رہتا ہے۔

اب وہ زمانے لد گئے جب صرف عید پر نئے جوتے نصیب ہوتے تھے۔ آج کے بچے بھی کپڑوں کے ساتھ جوتا میچ کر کے لیتے ہیں، کسی گھر میں جائیں تو گھر میں سب سے زیادہ تعداد میں جوتے ہی نظر آتے ہیں، دروازے کے ساتھ درجن بھر جوتے پڑے ہوں گے جس سے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کی تعداد کا اندازہ لگانا آسان ہو جاتا ہے۔ پھر کچن میں ایک آدھ جوتے کا جوڑا پریشان الٹا سیدھا پڑا ہوگا، باتھ کے دروازے پر پلاسٹک کے ایک دو جوڑے ہوں گے، اگر بیڈ روم میں چلے جائیں تو کھڑکی کے نیچے، بیڈ کے نیچے، ڈریسنگ میز کے نیچے الماری کے اندر ہر طرف طرح طرح کے جوتے پڑے پائیں گے۔ ہمارے ایشیائی گھروں میں یہ رواج عام پایا جاتا ہے کہ مہمان کو جوتے اتار کر ڈرائنگ روم میں بٹھایا جاتا ہے۔ جب کہ میزبان جوتوں سمیت سارے گھر میں دندناتا پھرتا ہے۔ لوگوں نے اپنے ڈرائنگ روم کو مسجدوں کی طرح جوتوں سے پاک رکھا ہوا ہے بس فرق یہ ہے کہ مسجد میں جوتا چوری ہونے کے ڈر سے بغل میں رکھا جاتا ہے۔ اور کسی کے گھر میں جوتا مین دروازے کے ساتھ اُتارا جاتا ہے۔ اور واپسی پر اپنا ہی جوتا پہن کر گھر جاتے ہیں۔ جب کہ اللہ کے

گھر مغفرت سے زیادہ جوتے کی فکر دامن گیر رہتی ہے۔

کسی غیر ملکی نے اپنے ہاں کی مسجد میں جب لوگوں کو جوتے کو محراب بنا کر سجدہ کرتے دیکھا تو کسی سے پوچھا کہ تم لوگ نماز پڑھتے وقت اپنے جوتے اپنے آگے کیوں رکھتے ہو؟ جواب ملا۔ اگر پیچھے رکھیں تو پھر جوتا نہیں ہوتا......!

ہمارے دیہات میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ لمبی مسافت کے دوران لوگ جوتیاں سر پر رکھ کر یا بغل میں دبا کر چل پڑتے تھے اور پھر جوں ہی منزل آتی ہے قریب کے کسی کنوئیں یا جوہڑ سے پاؤں دھوئے اور جوتا پہن لیا جاتا ہے...... اس طرح یہ جوتا ساری عمر چلتا تھا۔

ادھر یورپ میں جہاں باقی ہر شئے کی فراوانی ہے وہاں جوتے بھی کثرت سے اور ہر اقسام کے ملتے ہیں، کام پر جانے کے لئے اور، تو شام کی سیر کے لئے الگ، پارٹی کے لئے اور قسم کے، تو رقص و موسیقی کے لئے الگ قسم کے کھیل، کود کے لئے مخصوص، تو گھر میں پہننے کے لئے الگ، باتھ روم کے لئے علاحدہ، علاحدہ۔ غرض یہ کہ موسم کے لحاظ سے الگ الگ جوتے استعمال کئے جاتے ہیں۔

ہم جب پہلی بار انگلینڈ آئے تھے تو پانچ دن فیکٹری میں کام کرنے کی تنخواہ پانچ پونڈ ملی تھی۔ آج ہمارے بچے ایک جوڑا جوتوں پر اس رقم سے دس گنا زیادہ آنکھیں بند کر کے خرچ کر آتے ہیں۔ جتنی ہم چند سال قبل پورا مہینہ بچا کر گھر والدین کو بھیجتے تھے جو وہاں ایک بھرے پرے خاندان کے لئے مہینہ بھر کافی ہوتی......

یہاں جوتا پھٹ جائے تو اسے کوڑے میں پھینک دیا جاتا ہے کہ اسکی مرمت اتنی مہنگی ہوتی ہے کہ اس سے بہتر ہے کہ کچھ رقم مزید ڈال کر نیا جوتا خرید لیا جائے۔ جب کہ ہمارے ہاں دھوپ میں فٹ پاتھ پر بوری کی طرح پھٹی سی چادر تانے ایک شخص بیٹھا یہ دعا مانگ رہا ہوتا ہے کہ کسی گزرنے والے کا جوتا پھٹ جائے جس کی مرمت کر کے وہ اپنے بچوں کا پیٹ پال سکے۔

اپنے ہاں اب بھی جوتے کی مرمت اسی طرح کی جاتی ہے جیسے انسان کو ہر بار بیمار ہونے پر طرح طرح کی دوائیاں اور ٹیکے لگا کر زندہ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، وقت کے ساتھ ساتھ مرمت ہو کر اس طرح جوتا بھی اپنی شکل بدلتا رہتا ہے، وہ بھی ایک دن بوڑھا ہو کر اپنے مالک سے کہتا ہے کہ

اب مجھے پھینک کر کوئی دوسرا لو میں اب کسی موچی کے ہاتھوں مرمت نہیں ہو سکتا...... اور پھر بھی اسے پھینکا نہیں جاتا بلکہ کسی غریب کو دے کر ثواب کما لیا جاتا ہے۔

جوتوں نے جہاں غلطیوں کو دور کرنے اور حضرت انسان کو سدھارنے میں مدد دی وہاں اردو زبان کو بے شمار محاورے، اصطلاحیں اور ترکیبیں بھی دیں جو شاید کسی اور چیز کے نصیب میں کم آئیں۔ ملاحظہ فرمائیں...... (اپنا سر بچا کر)

جوتا کھانا، جوتا برسانا، جوتا سر پر ٹوٹنا، جوتا لگنا۔ جوتا مارنا، جوتو جوت، جوتی پر رکھ کر روٹی دینا، جوتی پر مارنا، جوتی کے برابر سمجھنا، جوتے اٹھانا، جوتے سے خبر لینا، جوتے ماری، جوتے کا یار، جوتیاں بغل میں مارنا، جوتیاں چٹخانا، جوتیاں سیدھی کرنا، جوتیوں کا صدقہ، جوتیوں میں بیٹھنا، جوتوں میں دال بٹنا، جوتیوں کا ہار اور ایسے کتنے اور محاورات جوتیوں کے صدقے ہماری زبان کو مالا مال کرتے ہیں۔

تاریخِ انسانی میں جگہ جگہ جس فراوانی سے جوتوں کی کارفرمائی دیکھنے میں آئی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ جوتوں کے بغیر جو بادشاہ، صدر، وزیر اور سلاطین مر گئے انہیں تاریخ نے بھی بھلا دیا۔ جوتوں کے ذکر سے دوزخ کا ماحول بھی نا آشنا نہیں، جہاں گناہ گاروں کو ایسے آتشیں جوتے پہنائے جائیں گے جن کی شدتِ حرارت سے ان کے باغی سروں کے اندر دماغ کھول اُٹھیں گے۔

تاریخ گواہ ہے کہ کہیں شاہانہ کروفر کی تسکین کے لئے انسانی کھالوں کے نرم و نفیس جوتے تیار کروائے گئے تو کہیں بڑے بڑے بادشاہوں اور سلطانوں کو جوتے چھوڑ کے بھاگتے دیکھا گیا۔ مگر افسوس کہ انسان نے ترقی کے زعم میں جوتوں کو صرف پاؤں تک محدود رکھا، جب تک ہمارے بزرگوں کے ہاتھوں میں یہ جوتا رہا ہے آداب، تہذیب کا دور دورہ رہا، اس کے معتدل اور متناسب استعمال سے میٹھا میٹھا سا درد ضرور ہوتا تھا، جو چند لمحوں بعد خود، بخود کافور ہو جاتا تھا۔ مگر جب سے چاقو چھری اور اب آتشیں اسلحے کا حصول آسان اور استعمال عام ہوا ہے جوتوں کا چلن دم توڑ رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی انسانیت بھی لہولہان ہو کے دم توڑتی جاتی ہے۔

اگر ہمارے ہاں جوتوں کے استعمال میں قدرے فرق آجائے اور جوتے کو قومی نشان کے طور پر

متعارف کرایا جائے تو یقین کیجئے بے شمار معاشرتی، گھریلو اور قومی برائیاں خود بخود دور ہو جائیں گی۔

☆

تمنا مظفر پوری جوتے کے قابل احترام استعمال کو عصر حاضر کا تقاضہ مانتے ہیں :

ایک زمانے سے ہم جوتے کا استعمال خود چلنے کے لئے کرتے آئے ہیں۔ جوتا خود نہیں چلتا رہا ہے۔ جوتا چلنا ایک محاورہ ہے جو گاہے گاہے کسی جلسے اور اسمبلی میں چلتے ہوئے دیکھا جاتا ہے اور وقتی طور پر خبر اخبار کی سرخی بنتی ہے۔ پھر لوگ اسے بھول جاتے ہیں۔ مگر جس جوتے کا ذکر کرنے جارہا ہوں وہ قابلِ احترام وزیارت ہے جسے سونے سے جڑے شیشے کی الماری میں رکھ کر کسی بڑے میوزیم میں رکھا جانا چاہیے۔

۱۵/دسمبر ۲۰۰۸ء دنیا کے لئے ایک تاریخی دن ہے، جب عراق میں امریکی صدر جارج بش کو ایک جرأت مند صحافی منتظر الزیدی نے جوتا پھینک کر مارا۔ (یوں تو صحافی کا قلم تلوار سے کم نہیں ہوتا مگر اب اس کا جوتا ایٹم بم سے زیادہ اہم ہو گیا ہے۔) جسے بش نے گھریلو جھگڑوں کی پریکٹس کی وجہ سے خود کو بچا لیا۔ (گھریلو جھگڑے کے لئے راقم الحروف کا مضمون بعنوان ''بیلن'' کا مطالعہ کریں)۔ ورنہ جوتا اس کے منھ پر پڑتا اور منھ پر جوتا مارنے کا محاورہ سچ ہو جاتا۔

مارنے کا عمل کئی طرح سے ہوتا ہے۔ کوئی تھپڑ اور لات سے مارتا ہے تو کوئی ڈنڈے استعمال کرتا ہے مگر سب سے خطرناک ماربلٹ (گولی) کی ہوتی ہے جس سے انسان دائمی اجل کو لبیک کہہ دیتا ہے۔ مگر اس سے کیا! بش کو کوئی گولی مار دیتا تو یہ واقعہ اتنا اہمیت کا حامل نہیں ہوتا جتنا کہ جوتا مارنا ہے کیونکہ پہلے بھی امریکہ کے کئی صدر گولی کھا کر مر چکے ہیں۔ مگر آج تک کسی نے صدر کے عہدے پر رہتے ہوئے جوتا نہیں کھایا۔ لہذا یہ واقعہ گنیز بک میں شہنشاہ جرأت منتظر الذیدی کے نام کے ساتھ درج ہونا چاہئے۔ بلکہ گنیز بک میں بش کا نام بھی شامل ہونا ضروری ہے کہ بش ملعون ہی پہلا امیر یکی صدر ہے جس نے جوتے کھائے۔ ویسے ایسے بے حیا بے غیرت بے شرم کا کیا! جو گرد جھاڑ کر کھڑا ہو جائے۔ کہاوت ہے۔ سو سو جوتے کھائینگے تماشہ گھس کر دیکھیں گے۔ اور کیا پتہ بش بھی منتظر کے جوتے کھا کر اپنی خوش نصیبی سمجھے کہ صدر کے عہدے پر ہوتے ہوئے جوتا کھانے کی تاریخ اس نے

بنائی ہے۔

اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ دنیا کا سب سے بڑا اور خطرناک اسلحہ کیا ہے؟ تو میرا جواب ہوگا 'جوتا'۔ یہ ایٹم بم سے کم نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ خطرناک اور گہرا زخم دیتا ہے۔ بم اور گولی سے انسان کی فوراً موت ہوجاتی ہے اور مرنے کے بعد دُنیا میں اس کے بارے میں کیا کہا جارہا ہے اور کون سا چرچہ ہے، کتنی تذلیل ہورہی ہے اسے کیا پتہ! نہ شرم وحیا کی بات ہے اور نہ پچھتانے کا موقع۔ مگر جوتے کھا کر انسان زندگی بھر اس کی چوٹ سے تڑپتا رہتا ہے اور شرمندگی وذلالت کی وجہ سے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں ہوتا۔ لہذا جوتے کی مار بہت ہی سخت ہے اور تمام جنگی اسلحے کی مار سے زیادہ کراری ہے۔ میں تو چاہوں گا کہ سلامتی کانسل کے جنرل سکریٹری بھی اس واقعہ سے سبق لیں گے اور امریکہ کی ہاں میں ہاں سے توبہ کرلیں گے۔ ان کے لئے اسی میں عقلمندی ہے کہ وہ کمزور اور بے گناہ ملک پر غلط الزام لگا کر جنگی حملہ کرنے کا ریزولوشن پاس نہیں ہونے دیں گے۔

مدت سے موقع کے منتظر، منتظر الزیدی کی اس جرأت مندانہ مردانگی کے بعد اُمید کی جاتی ہے کہ اب خون خرابے والی جنگ کی جگہ جوتے سے لڑی جانے والی جنگ ہوا کرے گی۔ سلامتی کانسل کو اس سلسلے میں پیش رفت کرنی ہوگی کہ آئندہ روایتی ہتھیاروں اور بارودی اسلحوں کے استعمال پر پابندی عائد کردی جائے۔ یعنی آئندہ ہونے والی جنگ جوتے کے ذریعہ ہو۔ حقوق انسانی تحفظ کمیشن کو بھی توجہ دینی چاہئے کیونکہ اس جنگ سے جانی نقصان کا کوئی خطرہ نہیں اور ملک کی معیشت پر بھی کوئی اثر نہیں پڑے گا بلکہ جوتا کاریگروں کو روزگار ملے گا۔ ملک میں جوتا انڈسٹریز کو فروغ حاصل ہوگا۔ جس سے ملک کی اقتصادی حالت مضبوط ہوگی۔ کمپنیاں نئے نئے ڈیزائن کے جوتے تیار کر بازار میں فروخت کے لئے بھیجیں گی۔ بلکہ ہیڈ پروف بش جوتے کے نام سے تیار جوتے کی مانگ ہونے لگے گی۔

جوتے کے اس قابلِ احترام استعمال سے ہوسکتا ہے عالمی انجمن خواتین کا اعتراض ہو کہ ان کی جوتی کا کیا ہوگا؟ اس طرح تو مرد کے جوتے کی اہمیت بڑھ جائے گی اور جوتی پیچھے رہ جائیگی۔ ان کے لئے عرض ہے کہ ان کی جوتی تو پہلے ہی سب پر سبقت لے جاچکی ہے اور جوتی میں دال بانٹنے کا کام کرتی ہے۔ جب جوتی میں دال بٹے گی تو بھلا کس کی ہمت ہے کہ آگے بڑھے۔ ویسے جوتی گھر

کی عزت ہے اسے خوانگی جنگ میں ہی استعمال کرنی چاہئے۔(جوتی میں دال بانٹنے کی وجہ تسمیہ کے لئے راقم الحروف کا مضمون ''بارے کچھ جوتے کا ذکر ہو جائے'' مضمون کا مطالعہ کریں۔)!

☆

منظور عثمانی کا انشائیہ حکمت اور بردباری کو سامنے لاتا ہے اور جوتوں کی برسات کا استقبال وہ اس طرح کرتے ہیں :

۱۸۵۷ء میں برٹش راج کے قائم ہونے کے بعد مغربی تہذیب سے متاثر لوگوں میں (جنہوں نے پاجامہ/ دھوتی کو دھتا بتا کر پتلون کو ٹانگ آشنا بنالیا تھا) ''ڈاسن کمپنی کا تیار کردہ جوتا بہت مقبول تھا۔ کیوں کہ ان لوازمات کے بعد ان کی روشن خیالی مستند نہیں خیال کی جاتی تھی۔

کیا خبر تھی کہ آج سواڈیڑھ سو سال بعد بھی جوتے کا چلن اتنا عام ہو جائے گا کہ یہ ملک میں ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی طور پر اپنی حیثیت منوالے گا۔ خیر ویسے تو جوتا پاپوش کی حیثیت سے ابتدائے آفرینش سے ہی انسان کی ضرورت رہا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جوتا اپنے صحیح مقام پر کبھی قانع نہیں رہا۔ جب جب اسے موقع ملا ہے، یہ ہاتھوں، لبوں اور سروں پر رقصاں نظر آیا ہے۔ بااختیار لوگوں کے پیروں میں پڑکر اس نے ہمیشہ کفش برداری ہی نہیں کفش بوسی بھی کرائی ہے۔

پیروں سے تو خیر جوتوں کا چولی دامن (محاورتاً) کا ساتھ رہا ہے۔ اور رہے گا۔ جوتوں سے پیروں کے ربط کی اس سے بڑی مثال کیا ہوسکتی ہے کہ الٹرا موڈ لڑکیوں کے جسموں پہ آج جبکہ سوائے چند دھجیوں کے سب کچھ ہوا ہو چکا ہے لیکن وفادار ساتھیوں کی طرح جوتے آج بھی ساتھ نبھائے ہوئے ہیں۔

کہاوت ہے کہ جوتی چاہے سونے کی ہی کیوں نہ ہو اس کا اصل مقام پیر ہی ہے۔ لیکن جس طرح آج کے دور میں جوتوں کو پر لگے ہیں اس کے پیش نظر یہ کہاوت کچھ باطل سی لگنے لگی ہے۔ کوئی دن نہیں جاتا کہ یہ خبر اخبار کی سرخی نہ بنتی ہو کہ آج جوتے نے فلاں کے سر کا نشانہ سادھا، آج فلاں نے فلاں کا۔

المنتظر زیدی کے جوتوں نے بش دی گریٹ کے سر پر غرور کو کیا تاکا کہ محسوس ہونے لگا ہے

جوتوں نے اپنی جائے رہائش ہی تبدیل کر دی ہے۔ اس کے بعد نہایت تواتر کے ساتھ کبھی تو اسرائیل کے سویڈن کے سفیر نے، کبھی چین کے پرائم منسٹر وین جیاباؤ نے جوتے سونگھے، کبھی اسرائیل کے غازہ پر ڈھائے مظالم کے خلاف ٹین ڈوننگ اسٹریٹ کی طرف مظاہرین نے جوتے برسائے۔

آج کل کے لوک سبھا کے چناؤ کے دوران جوتوں کی پرواز ہمارے نیتاؤں کے سروں کی طرف ہے۔ وزیر داخلہ جناب چدمبرم کی طرف دینک جاگرن کے نامہ نگار جرنیل سنگھ نے جوتا اچھالا، نوین جندل کی چناؤ سبھا میں ایک ریٹائرڈ پرنسپل صاحب نے جوتا پھینکا۔ جوتوں کی دیکھا دیکھی کھڑاؤں کو بھی نہ جانے کیا شوق چرایا کہ لوح پرش اور مضبوط نیتا جو پرائم منسٹر شپ کے دعویدار بھی تھے، کے سر سے ٹکرانے کی جرأت کی۔ اچھا ہوا کہ ''بھگوان رام کی'' کرپا سے وہ سر پر نہیں لگی ورنہ تو ضرور ''خون خرابہ'' ہو جاتا۔ کیوں کہ ''چھوٹے سرکار'' کے سر پر تو کسی قسم کی Hairy Protection بھی نہیں ہے۔ خیر ہوئی۔ ورنہ۔

کہتے ہیں ''کھڑاؤں مار'' صاحب کا تعلق لوح پرش کے پریوار سے ہی ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر کھڑاؤں کا جوتے کی جگہ استعمال بالکل مناسب تھا کیوں کہ بھارتیتا کا تعلق جوتے سے کہیں زیادہ کھڑاؤں سے ہے۔ حق بہ حق دار رسید۔

جوتے کی مار تذلیل کی کبھی معراج سمجھی جاتی تھی لیکن کیا زمانہ آیا ہے کہ اب ہمارے رہبران عظام و اعلیٰ مقام جوتے کھا کر بھی ذرا منقبظ ہو لیں۔ بش صاحب اسی پر نازاں و شاداں کہ ''انہوں نے جوتوں کو چھکائی'' دیدی۔ چدمبرم صاحب نے تو نہایت خندہ پیشانی سے نہ صرف جوتا زن کو معاف ہی کر دیا بلکہ ان کی پارٹی نے تو جوتوں میں لپیٹ کے جو پیغام دیا تھا اسے پڑھ کر دو معتوب امیدواروں کے ٹکٹ ہی کاٹ دیے۔ اسے جوتوں کا اعزاز ہی کہا جائے گا کہ جوتے ہائی کمان سے بھی زیادہ پر اثر ثابت ہوئے۔

سب سے زیادہ مردانگی اور بے جگری کا ثبوت ہمارے مرد آہن جناب اڈوانی صاحب نے دیا کہ اپنے اوپر پھینکی ہوئی کھڑاؤں ''جوتے کی لگی سگی'' کو آنکھ اٹھا کر تک نہ دیکھا، ایسا ہی مضبوط ہونا چاہئے دیس کا پرائم منسٹر۔ جوتوں سے ہمارے رہبران ذی وقار نے کس حد تک سمجھوتا کر لیا ہے اس کا

ثبوت پناجی (گوا) کے راجیہ سبھا کے کانگریس ممبر جناب شانتارام نائک پر جب فوڈ پیکٹ (جسے یقیناً محترم نے پنی میں لپٹا ہوا جوتا ہی سمجھا ہوگا) پھینکا گیا تو موصوف نے کمال فراخ دلی کے ساتھ فرمایا، جمہوریت میں اس طرح کے جذبات میں شدید غصہ کا اظہار فطری ہے۔ ہمیں فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے معاف کر دینا چاہئے۔ مرحبا! شاید یہ وہی مرحلہ زیست ہے۔ جس کے پیش نظر غالب نے کہا تھا۔

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

میر تقی میرؔ بے سبب ہی خرابیٔ زمانہ کے خوف سے دونوں ہاتھوں سے دستار تھامتے تھامتے مر گئے۔ خدا خوش رکھے ہمارے ''رہبران باضمیر'' کو کہ ان کی مساعی جمیلہ کے نتیجے میں آج وہ زریں دور آ پہنچا ہے کہ اب فخر کا مقام یہ ہے کہ۔

ہم سر تو بچا لائے بلا سے
''دستار سر بازار گرے''

بڑوں سے سنتے آئے تھے کہ اصلاح کے لئے پہلی شرط ندامت اور شرمندگی ہے یا دوسرے اقبال کے لفظوں میں ''احساس زیاں۔'' لیکن افسوس بقول اکبر ہم ''اندھے بھی ہیں اور سوجھی رہے ہیں۔''

جاگے وہ جو سویا ہوا ہو، جاگے کو بھلا آج تک کون جگا یا ہے۔ یہاں بے حسی کی ہمیں دو زندہ مثالیں یاد آ گئیں۔ باضمیر لوگوں کو یاد ہوگا کہ راج ناتھ سنگھ یوپی کے وزیر اعلیٰ تھے کہ گورکھپور کے میئر کے الکشن میں ایک ہیجڑہ آشا دیوی نام کا جیت کر آیا تھا، اس کے باوجود کہ وزیر اعلیٰ اور ان کے سات عدد وزراء نے آشا کے خلاف مہم چلائی تھی۔ اسی زمانہ میں کئی اور زنخے اسمبلیوں میں جیت چکے تھے۔ لیکن بجائے اس کے نیتا لوگ اس پیغام کو نوٹ کرتے جو جنتا نے دیا تھا الٹا مدھیہ پردیش کے بھاجپا ادھیکش شری مان وکرم ورما نے اعلان فرمایا کہ ''پتیم آن ملو۔'' یعنی یہ کہ ہماری پارٹی ذات، نسل، رنگ یا جنس کی بنیاد پر کسی شخص کے خلاف امتیاز نہیں کرے گی۔ اس لئے بھاجپا کی ممبر سازی میں

ہیجڑے شامل ہو سکتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ نتیش کمار جی نے اپنی تیرہ دن کی منسٹری میں کیا تھا کہ موصوف سمرتھن جٹانے کے لئے Jail Birds (طائران قفس) سے جا ملے۔ اعتراض پر فرمایا ''انہیں مجرم نہ کہو آنریبل ممبران کہو۔ جیت کر آئے ہیں۔''

کہا تو جاتا ہے کہ ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کر دیتی ہے۔ ذرا اس تالاب سیاست پر غور کیجئے جس میں ایک نہیں انیک گندی مچھلیاں ہیں۔

ایسے ماحول میں عوام ایسے رہبروں پر جوتے نہیں تو کیا برسائیں گے۔

آنے والے دور کی پیشن گوئی کے طور پر دو زندہ مثالیں پیش ہیں۔ ایک گاؤں میں ایک استقبالیہ دوار بنایا گیا ہے جس میں گلے سڑے جوتے ہار کی شکل میں لٹکے ہوئے ہیں۔ امیدوار کے لئے شرط یہ رکھی گئی ہے کہ جو ووٹ مانگنے آئے جوتوں کے سائے سے گزرتا ہوا آئے۔

ایک اور گاؤں میں، جوتا ماری، اسکول کھولا گیا ہے جس میں نوجوانوں کو نشانہ بازی سکھائی جاتی ہے۔ کیوں کہ دیکھا یہ جا رہا ہے کہ جوتا اپنے ہدف تک نہیں پہنچ پاتا اس لئے ٹریننگ ضروری ہے کہ :

''نشانہ چوک نہ جائے!''

لیکن ہمارے رہبران اعلیٰ مقام پر جو غفلت طاری ہے اس کے چلتے ہمیں یقین کامل ہے کہ :

''یہ وہ نشہ نہیں جسے جوتا اتار دے''

اس لئے حفظ رہبران کی خاطر ایک مشورہ پیش ہے کہ اسٹیج پر ان نیتاؤں کے گرد ایک ''ہلکا پھلکا'' سا جنگلہ رکھ دیا جائے۔ جس حصار میں بیٹھ کر نیتا گن خود کو سرکشت محسوس کر سکیں۔ اس سے یہ گارنٹی تو مل ہی جائے گی کہ جوتا آئے گا بھی تو منزل مقصود قطعی نہ پائے گا۔ اتنا ہی بہت ہے چکنی مٹی سے بنے ہوئے قائدوں کے لئے۔

☆

سید علیم اشرف جائسی نے اپنے انشائیہ میں جوتے کو انسانی نقطۂ نظر سے دیکھا ہے۔ اور اس کے استعمال کو قربت سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن یہ قربت کیسی ہوتی ہے، ملاحظہ کیجئے :

عراقی صحافی منتظر زیدی کے نعل (جوتا) نے جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ اب تک نہ مال سے ہو

سکا ہے، نہ قیل وقال سے ہوسکا ہے اور نہ کسی علمی مقال سے ہوسکا ہے۔ اور اس نعل نے ذرائع ابلاغ میں وہ بھونچال مچایا ہے جو نہ رائفل کی گولی سے بن پڑا ہے، نہ توپ کے گولوں سے۔ منتظر زیدی کے نعلین یا جوتوں کی بازگشت ہمہ گیر بھی ہے اور عالمگیر بھی ہے، حالیہ الیکشن میں مسٹر اڈوانی سمیت متعدد سیاسی شخصیات پر اچھالے گئے جوتے اس کی آفاقیت و عالمگیریت کی روشن دلیل ہیں۔ اور یہ بازگشت صرف ثقافتی محفلوں وسفارتی حلقوں اور اخباری کالموں میں ہی نہیں سنائی دے رہی ہے بلکہ زبان وادب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے ہیں۔

عرب اپنے غصے کے اظہار کے لئے مخاطب سے جو سخت ترین بات کہتا وہ ہے: "**عليك اللعنة**" لیکن حادثہ نعلین کے بعد وہ "علیک اللعنۃ" کہنے کے بجائے "علیک النعلۃ" (تم پر جوتے پڑیں) کہنے کو زیادہ معنی خیز اور اپنے غصے کی زیادہ بلیغ تعبیر ماننے لگا ہے۔ لفظ "لعنت" کے دوسرے مشتقات بھی "نعلۃ" کے ہم صیغہ وہم وزن مشتقات کی جگہ لینے لگے ہیں۔ چنانچہ یا ملعون کی جگہ یا منعول، لعنتی کے بجائے نعلتی اور تلعین (لعنت بھیجنا) کے مقام پر تنعیل کے استعمال میں اضافہ ہوا ہے۔ تلعین یا لعنت بھیجنے کے مقابلے میں تنعیل کی فضیلت کی ایک دلیل یہ بھی دی جارہی ہے کہ اکثر فقہاء نے شخصی لعنت کو محظور قرار دیا ہے جبکہ تنعیل کے سلسلے میں ایسی کوئی تفریق منقول نہیں ہے۔

منتظر زیدی کے جوتوں نے عرب احساسات وجذبات کی جیسی واضح اور سچی ترجمانی کی ہے اس کے پیش نظر یہ خیال ہے کہ عباسی عہد کا نامور شاعر ابوتمام اگر آج ہوتا تو اپنے مشہور قصیدۂ بائیہ کے مطلع کو شاید یوں کہتا:

النعل أصدق أنباء أمن الكتب

فی کعبه الحدبين الجدواللعب

واضح رہے کہ ابوتمام نے اپنے پہلے مصرعے میں "النعل" کی جگہ "السیف" اور "کعبہ" کے بجائے "حدہ" کا استعمال کیا ہے۔ اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ تلوار کتابوں سے زیادہ سچی خبریں دینے والی ہے، اور اس کی حد یعنی دھار میں ہی سنجیدگی اور مزاح کی حد پوشیدہ ہے۔ لیکن اس کے سبب ابوتمام کی گرفت جائز نہیں ہے کیونکہ وہ منتظر زیدی کا معاصر شاعر نہیں ہے، لہٰذا اسے معذور

سمجھنا چاہئے۔

منتظری نعل کی تاثیر سے یہ ممکن ہے کہ مستقبل میں ''بال بال بچا'' کے بجائے ''نعل نعل بچا'' کا استعمال کیا جائے اور موت کی انتہائی قربت کی تعبیر کے لئے اس طرح کی مثل کا استعمال ہو: فلاں یوں بچا کال (موت) سے جیسے بش منتظر کی نعل سے وغیرہ۔

بعض کالم نویسوں کے نزدیک منتظر زیدی کا یہ عمل عربی روایات کے خلاف اور مہمان نوازی کے عربی اصول سے متصادم ہے۔ منتظر کو بحیثیت صحافی اپنے جذبات کی ترجمانی کے لئے نعال کے بجائے مقال کا استعمال کرنا چاہئے تھا۔ ان حضرات کے نزدیک منتظر زیدی نے کوٹ نیت (ڈپلومیسی) کے بجائے بوٹ نیت کا استعمال کر کے عربوں کے پچاس سالہ ریکارڈ کو خراب کیا ہے۔ اور منتظر نے پچاس سال سے زیادہ پرانے طریقے کو استعمال کر کے اپنے بیک ورڈ ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ ان کے خیال میں عربوں کی اکثریت اس غیر عربی طریقے کو پسند نہیں کرے گی۔ لیکن خواہش کو خبر بنانے والے ان ''ترقی پسندوں'' سے قطع نظر زمینی حقیقت یہ ہے کہ عرب عوام منتظر کے اس اقدام یا ''انعال'' سے متفق ہی نہیں خوش بھی ہیں۔ محتاط حضرات کی اکثریت بھی کم از کم'' نہ ایں کارے می کنم نہ انکارے می کنم'' پر عمل پیرا ہے۔ انٹرنیٹ پر ایک مشہور اشتہاری ویب سائٹ نے لاکھوں عرب قارئین کے پیغامات اور تبصروں کو شائع کیا ہے، تقریباً سبھوں نے منتظر کی تائید کی ہے۔ یہ ویب سائٹ معذرت خواہوں کے لئے نعل منتظری سے کم نہیں ہے۔ نعل منتظری سے متعلق یہ عربی زاویہ نگاہ ہے۔ لیکن ہم میں سے بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اس عالم گیر شہرت کے حامل نعل سے متعلق مغربی بالخصوص امریکی نقطۂ نظر سے واقف ہوں گے۔ اس امر سے واقفیت آپ کو بھی اس نعل کے کمال یعنی اس کی پیغام رسانی کی قوت و وسعت کا یقین دلا دے گی۔

ذیل میں کچھ امریکی شہریوں کے تبصرے نقل کئے جا رہے ہیں جنھیں معروف انگریزی میگزین نیویارک ٹائمز نے اپنے ۱۵ر دسمبر ۲۰۰۸ء کے شمارے میں شائع کیا ہے:

ا۔ بش پر جوتا باری بلاشبہ ایک جرأت مندانہ قدم ہے۔ لیکن عراق میں بش کے ذریعے کی جانے والی قتل و غارت گری کا اس سے موازنہ نہیں کرنا چاہئے۔

۲۔ ہر امریکی کو چاہئے کہ وہ کرسمس کے موقعے پر بطور تحفہ ایک جوڑا جوتا وہائٹ ہاؤس کو روانہ کرے۔ میرے خیال میں دس ملین جوڑے ضرورت کو کافی ہوں گے۔

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ہالینڈ کے ایک شہری نے لکھا ہے کہ :

میرے پاس ایک پرانا اور بوسیدہ جوتا ہے۔ اگر آپ کے صدر نے میرے ملک کا دورہ کیا تو میں اس کے ذریعے ان کا استقبال کروں گا البتہ چونکہ میں سخت گیر اور متشدد نہیں ہوں لہٰذا میری کوشش ہوگی کہ جوتا انھیں لگنے نہ پائے۔ یعنی رمی جمار کی علامتی کوشش ہی کافی ہے۔

۳۔ ہمارے صدر پر جوتا باری کی لذت اندوزی صرف غیر ملکیوں کے لئے ہی خاص نہیں ہونا چاہئے۔ میری خواہش ہے کہ حصول لذت کا یہ موقع امریکی شہریوں کو بھی فراہم کیا جائے۔

۴۔ اگر صدر بش پر جوتا باری کا موقع امریکیوں کو نصیب ہو تو یقین ہے کہ اتنے جوتے ضرور اکٹھے ہو جائیں گے جو پورے وہائٹ ہاؤس کو ڈھنک سکیں اور اس عمل میں شرکت میرے لئے بھی باعث مسرت ہوگی۔

۵۔ میں ایک امریکی شہری ہوں میں نے "Face book" پر ایک ویب سائٹ قائم کیا ہے اور اس کی ممبر شپ ہر اس شخص کے لئے ہے جو ہمارے صدر پر جوتا پھینکنے والے جانباز کو چاہنے والا ہے۔ اور ابھی تھوڑی دیر پہلے جب میں نے اپنے سائٹ کو دیکھا ہے تو ممبروں کی تعداد ۱۰۵۰۰ ہوگئی ہے۔

۶۔ اہم بات یہ کہ ہمیں ایک خیراتی ادارہ قائم کرنا چاہئے جو امریکیوں کے جوتوں کو جمع کر کے بطور چندہ اس عراقی صحافی کو پیش کرے۔ ہمارا یہ عمل اپنے صدر کے خلاف ہمارے غم و غصے کی دلیل بھی ہوگا اور عراقی عوام کے تئیں ہماری ہمدردیوں کا ثبوت بھی ہوگا۔

خیال رہے کہ ان تبصروں کو چھانٹا نہیں گیا ہے بلکہ پرچے میں شامل تبصروں کا یہی عام رجحان ہے۔ یہ سچ ہے کہ بعض امریکی تبصروں میں نعل منتظری کی تنقید بھی ملتی ہے، چند ایک میں اس جوتا باری کی مذمت بھی کی گئی ہے اور اس کو نہ صرف جارج بش بلکہ پورے امریکہ کو توہین قرار دیا گیا ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ان تبصروں کی بھاری اکثریت میں اس واقعہ پر اپنی پسندیدگی ظاہر کی گئی ہے اور

مختلف رنگ و آہنگ میں صدر بش اور ان کی سیاست کی چٹکیاں لی گئی ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ نیویارک ٹائمز کے اسی شمارے میں جن عراقیوں کی رائے ذکر کی گئی ہے ان کی اکثریت نے منتظر زیدی کے اس اقدام کی مخالفت کی ہے اور اس طرح امریکی عوام سے ملنے والی شرمندگی و پشیمانی کو ہلکا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ورنہ نعل منتظری کے تعلق سے عربی رائے عامہ کے بارے میں کون نہیں جانتا؟ نیویارک ٹائمز کے نمائندے نے صرف منتخب آراء کو اپنے صفحات پر جگہ دی ہے اور یوں عراقی عوام کی غلط ترجمانی کی ہے۔

آخر میں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ نیویارک ٹائمز ہو یا امریکہ میں شائع ہونے والے دوسرے مقالات اور تبصرے ہوں ان میں سے کسی میں منتظر زیدی کے اس عمل کو پیشہ ورانہ نقطہ نظر سے نہیں دیکھا گیا ہے اور صرف چند لوگوں نے ہی اسے صحافت کے پیشہ ورانہ ضابطہ اخلاق کے خلاف قرار دیا ہے۔ اکثریت نے اس واقعہ کو انسانی نقطہ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے اور اسے ایک ایسے مظلوم و بے بس عراقی شہری کے ردعمل کے طور پر لیا ہے جس کے ملک پر امریکی نظام نے غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے جس کے نتیجے میں پورا ملک کھنڈر بن چکا ہے اور ہزاروں ہزار افراد لقمۂ اجل بن چکے ہیں۔

☆

جوتے پر افسانے بھی بہت لکھے گئے ہیں۔ کاروباری اور صنعتی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ علمی و ادبی فکر و نظر کے نقش ہائے رنگ رنگ کی جلوہ سامانی کے لئے اسے اعتبار بخشنے کے لئے لکھے گئے ہیں۔ سدرشن، مہندر ناتھ، خواجہ احمد عباس، کرشن چندر اور دوسرے افسانہ نگاروں کے جوتے پر افسانے اردو میں مقبول ہیں :

احمد ندیم قاسمی کا افسانہ جوتا شناسی کی نمائندگی اس طرح کرتا ہے۔ انہوں نے ایک محاورے کو افسانہ کا اختتامیہ بنایا ہے :

”چودھری نے کرموں کے چلائے ہوئے چابک سے بے نیاز ہو کر اپنے منشی سے کہا۔ ”لو بھئی دے دو اسے تین سو چوبیس۔“

”روپے منشی جی، تین سو چوبیس روپے“! کرموں نے منشی کو تاکید کی۔

''روپے نہیں تو پیسے؟'' منشی نے قمیض کے نیچے پہنی ہوئی واسکٹ کی اندرونی جیب میں سے نوٹوں کا ایک گٹھا نکالتے ہوئے پوچھا۔

''میرا مطلب تھا کہیں آپ تین سو چوبیس روپے دینے کی جگہ تین سو چوبیس جوتے لگانے نہ بیٹھ جائیں۔''

چودھری سمیت سب لوگ زور سے ہنسے مگر سب کی ہنسی کا مفہوم الگ الگ پہچانا جا سکتا تھا۔ چودھری تو یوں ہنسا جیسے اس کا سینہ ٹین کا ایک کنستر ہے اور کرموں نے اسے جھنجھوڑ کر اس میں پڑے ہوئے کنکر بجا دیئے ہیں۔

کرموں نے روپے لئے اور مسکراتا ہوا چلا گیا۔

تب چودھری اپنے سامنے کمبل پھیلوا کر مسکرایا۔ اسے خوب اچھی طرح جھڑوایا جیسے کمبل کا میراثی ناپنا نکال رہا ہے۔ اسے تہ کرا کے منشی کے حوالے کیا کہ گھر پہنچا دو'' کہنا اسے دن بھر دھوپ دکھائیں اور پھر کسی پیٹی میں پھینک دیں۔'' پھر وہ حاضرین سے مخاطب ہوا'' درجنوں پڑے ہیں اس طرح کمبل۔ مگر میں دو پیسے کے میراثی کو ڈھائی تین سو روپے کا کمبل اوڑھے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ جوتے کو پاؤں ہی میں رہنا چاہئے!''

☆

کائنات کے رنگ و تحریک میں زندگی کا عکس راجندر سنگھ بیدی خوب تر مفہوم و مطالب کے ساتھ دیکھتے ہیں اور لطیف تر بنا کر پیش کرتے ہیں۔ جوتا کو بھی انہوں نے تماشائے طاقت بنایا ہے اور اسے انفرادی شناخت عطا کی ہے، جس میں فن تلخ تجربات کا غماز ہے۔ پورا افسانہ اس طرح ہے :

دن بھر کام کرنے کے بعد جب بوڑھا رحمان گھر پہنچا تو بھوک اُسے بہت ستا رہی تھی۔ ''جینا کی ماں۔ جینا کی ماں!'' اس نے چلاتے ہوئے کہا...... ''کھانا نکال دے بس جھٹ سے۔'' بڑھیا اس وقت اپنے ہاتھ کپڑوں لتوں میں گیلے کئے بیٹھی تھی، پیشتر اس کے کہ وہ اپنے ہاتھ پونچھ لے، رحمان نے ایک دم اپنے جوتے کھاٹ کے نیچے اُتار دیئے اور کھدر کے ملتانی تہمد کو زانوؤں میں دبا، کھاٹ پر چوکڑی جماتے ہوئے بولا۔ "بسم اللہ۔"

بڑھاپے میں بھوک جوان ہو جاتی ہے۔ رحمان کی بسم اللہ بڑھاپے اور جوانی کی اس دوڑ میں رکابی سے بہت پہلے اور بہت دور نکل گئی تھی اور ابھی تک بڑھیا نے بجی اور نیل میں بھگوئے ہوئے ہاتھ دوپٹے سے نہیں پونچھے تھے۔ جینا کی ماں برابر چالیس سال سے اپنے ہاتھ دوپٹے سے پونچھتی آئی تھی اور رحمان قریب قریب اتنے ہی عرصے سے خفا ہوتا آیا تھا۔ لیکن آج یک لخت وہ خود بھی اس وقت بچانے والی عادت کو سراہنے لگا تھا۔ رحمان بولا۔ ''جینا کی ماں، جلدی ذرا'' ......اور بڑھیا اپنی چالیس سالہ دقیانوسی ادا سے بولی۔ ''آئے ہائے، ذرا دم تو لے بابا تو!''

سوئے اتفاق رحمان کی نگاہ اپنے جوتوں پر جا تھمی جو اس نے جلدی سے کھاٹ کے نیچے اتار دیے تھے۔ رحمان کا ایک جوتا دوسرے جوتے پر چڑھ گیا تھا۔ یہ مستقبل قریب میں کسی سفر پر جانے کی علامت تھی۔ رحمان نے ہنستے ہوئے کہا:

''آج پھر میرا جوتا جوتے پر چڑھ رہا ہے، جینا کی ماں ...... اللہ جانے میں نے کون سے سفر پہ جانا ہے!''

''جینا کو ملنے جانا ہے اور کہاں جانا ہے؟'' ...... بڑھیا بولی! ''یونہی تو نہیں تیرے گوڈر ڈھور ہی ہوں، بڈھے! دو پیسے ڈبل کا تو نیل ہی لگ گیا ہے تمہارے کپڑوں کو۔ کیا تو دو پیسے روج کی کمائی بھی کرے ہے؟''

''ہاں ہاں!'' بڈھے رحمان نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کل میں نے اپنی اکلوتی بچی کو ملنے انبالے جانا ہے۔ تبھی تو یہ جوتا جوتے سے نیارا نہیں ہوتا۔'' پارسال بھی جب یہ جوتا جوتے پر چڑھ گیا تھا تو رحمان کو پرچی ڈالنے کے لئے ضلع کچہری جانا پڑا تھا۔ اس کے ذہن میں اُس سال کا سفر اور جوتوں کی کرتوت اچھی طرح سے محفوظ تھی۔ ضلع کچہری سے واپسی پر اسے پیدل ہی آنا پڑا تھا۔ کیونکہ ہونے والے ممبر نے تو واپسی پر اس کا کرایہ بھی نہیں دیا تھا۔ اس میں ممبر کا قصور نہ تھا۔ بلکہ جب رحمان پرچی پر نیلی چرخی کا نشان ڈالنے لگا تھا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور اس نے گھبرا کر پرچی کسی دوسرے ممبر کے حق میں دے دی تھی۔

جینا کو ملے دو سال ہونے کو آئے تھے۔ جینا انبالے میں بیاہی ہوئی تھی۔ ان دو سالوں میں

آخری چند ماہ رحمان نے بڑی مشکل سے گزارے تھے۔ اسے یہی محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی دہکتا ہوا اُبلا اس کے دل پر رکھا ہوا ہے جب اسے جینا کو ملنے کا خیال آتا تو کچھ سکون، کچھ اطمینان میسر ہوتا۔ جب ملنے کا خیال ہی اس قدر تسکین دہ تھا تو ملنا کیسا ہوگا؟...... بڈھا رحمان بڑی حیرت سے سوچتا تھا۔ وہ اپنی لاڈلی بیٹی کو ملے گا اور پھر تلنگوں کے سردار علی محمد کو۔ پہلے تو وہ رو دے گا، پھر ہنس دے گا، پھر رو دے گا اور اپنے ننھے نواسے کو لے کر گلیوں، بازاروں میں کھلاتا پھرے گا............ ''یہ تو میں بھول ہی گیا تھا جینا کی ماں!'' رحمان نے کھاٹ کی ایک کھلی ہوئی رسی کو عادتاً گھسا کر کاٹتے ہوئے کہا...... ''بڑھاپے میں یادداشت کتنی کمزور ہو جاتی ہے۔''

علی محمد، جینا کا خاوند، ایک وجیہہ جوان تھا۔ سپاہی سے ترقی کرتے کرتے وہ نائیک بن گیا تھا۔ تلنگے اسے اپنا سردار کہتے تھے۔ صلح کے دنوں میں علی محمد بڑے جوش و خروش سے ہاکی کھیلا کرتا تھا۔ این ڈبلیو، آر، پولیس مین، بریگیڈ والے، یونی ورسٹی والے اس نے سب کو ہرا دیے تھے۔ اب تو وہ اپنی ایمٹی کے ساتھ بصرہ جانے والا تھا۔ کیوں کہ عراق میں رشید علی بہت طاقت پکڑ چکا تھا...... اس ہاکی کی بدولت ہی علی کمپنی کمانڈر کی نگاہوں میں اونچا اُٹھ گیا تھا۔ نائیک بننے سے پہلے وہ جینا سے بہت اچھا سلوک کرتا تھا لیکن اس کے بعد وہ اپنی ہی نظروں میں اتنا بلند ہو گیا تھا کہ جینا اسے پاؤں تلے نظر نہ آتی تھی۔ اس کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ مسز ہولٹ، کمپنی کمانڈر کی بیوی نے تقسیم انعامات کے وقت انگریزی میں علی محمد سے کچھ کہا تھا جس کا ترجمہ صوبیدار نے کیا تھا...... ''میں چاہتی ہوں تمہاری اسٹک چوم لوں۔'' علی محمد کا خیال تھا کہ لفظ اسٹک نہیں ہوگا، کچھ اور ہوگا۔ بڑا حاسد ہے صوبیدار، انگریزی بھی تو بس گوہانے تک ہی جانتا ہے۔

رحمان کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے اسے اپنے داماد سے نہیں بلکہ کسی بہت بڑے افسر سے ملنے جانا ہے۔ اس نے کھاٹ پر سے جھک کر جوتے پر سے جوتا اُتار دیا۔ گویا وہ انبالے جانے سے گھبراتا ہو۔ اس عرصے میں جینا کی ماں کھانا لے آئی۔ آج اس نے خلاف معمول گوشت پکا رکھا تھا۔ جینا کی ماں نے گوشت بڑی مشکل سے قصبے سے منگوایا تھا۔ اور اس میں گھی اچھی طرح سے چھوڑا تھا۔ چھ ماہ پہلے رحمان کو تلی کی سخت شکایت تھی۔ اس لئے وہ تمام مولذات سودا، گڑ، تیل، بینگن، مسور کی دال،

گوشت اور چکنی غذا سے پرہیز کرتا تھا۔ اس چھ ماہ کے عرصے میں رحمان نے شاید سیر کے قریب نوشادر چھاچھ کے ساتھ گھول کر پی لیا تھا تب کہیں اس کے سانس کی تکلیف دور ہوئی تھی۔ بھوک لگنے کے علاوہ اس کے پیشاب کی سیاہی سپیدی میں بدلی تھی۔ آنکھوں میں گدلا پن اور تیرگی ویسے ہی نمایاں تھی۔ پلکوں پر کی بھربھراہٹ بھی قائم تھی۔ اور جلد کا رنگ سیاہی مائل نیلگوں ہو گیا تھا۔ گوشت دیکھ کر رحمان خفا ہو گیا۔ بولا...... "چار پانچ روز ہوئے تو نے بینگن پکائے تھے۔ جب میں چپ رہا۔ پرسوں مسور کی دال پکائی جب بھی چپ رہا۔ تو تو بس چاہتی ہے کہ میں بولوں ہی نہیں۔ مری مٹی کا ہور ہوں۔ سچ کہتا ہوں تو مجھے مارنے پہ تلی ہے جینا کی ماں۔"

بڑھیا پہلے روز سے ہی، جب اس نے بیگن پکائے تھے، رحمان کی طرف سے اس احتجاج کی متوقع تھی۔ لیکن رحمان کی خاموشی سے بڑھیا نے الٹا ہی مطلب لیا۔ دراصل بڑھیا نے قریب قریب ایک نکھٹو کے لئے اپنا ذائقہ بھی ترک کر ڈالا تھا۔ بڑھیا کا سوچنے کا ڈھب بھی نیارا تھا۔ جب سے وہ پیٹ بڑھے ہوئے اس ڈھانچ کے ساتھ وابستہ ہوئی تھی۔ اس نے سکھ ہی کیا پایا تھا۔ لیکن ایک تربوز پر سے پھسل کر گھٹنا توڑ بیٹھنے سے اس نے پنشن پالی تھی اور گھر میں بیٹھ رہا تھا۔ بڑھیا نے کپڑے چھانٹتے ہوئے کہا...... "تو نہ کھا بابا...... تیری خاطر میں تو نا مروں، مجھے تو روج دال، روج دال میں کچھ مجا نہیں دکھے۔"

رحمان کا جی چاہتا تھا کہ وہ کھاٹ کے نیچے سے جوتا اٹھالے اور اس بڑھیا کی چندیا پر سے رہے سہے بالوں کا بھی صفایا کر دے۔ سر کی پشم کے اترتے ہی بڑھیا کا دائمی نزلہ بھی دور ہو جائے گا۔ لیکن چند ہی لقمے منہ میں ڈالنے کے فوراً ہی اُسے خیال آیا۔ تلی ہوتی ہے تو ہوتی رہے۔ کتنا ذائقے دار گوشت پکایا ہے میری جینا کی ماں نے۔ میں تو ناسکرا ہوں پورا۔ اور رحمان چٹخارے لے لے کر ترکاری کھانے لگا۔ سالن کا ترکیا ہوا لقمہ جب اس کے منہ میں جاتا تو اسے خیال آتا۔ آخر اس نے جینا کی ماں کو کون سا سکھ دیا ہے؟ وہ چاہتا تھا کہ اب تحصیل میں چپراسی ہو جائے اور پھر اس کے پُرانے دن واپس آ جائیں۔

کھانے کے بعد رحمان نے اپنی انگلیاں پگڑی کے شملے سے پونچھیں اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ کسی نیم

شعوری احساس سے اس نے اپنے جوتے اُٹھائے اور انھیں دالان میں ایک دوسرے سے اچھی طرح علاحدہ علاحدہ کر کے ڈال دیا۔

لیکن اس سفر سے چھٹکارا نہیں تھا، ہر چند کہ اپنی آٹھ روزہ مکّی میں نلائی لازمی تھی۔ صبح دالان میں جھاڑو دیتے ہوئے بڑھیا نے بے احتیاطی سے رحمان کے جوتے سرکا دیے اور جوتے کی ایڑی دوسری ایڑی پر چڑھ گئی۔ شام کے قریب ارادے پست ہو جاتے ہیں۔ سونے سے پہلے انبالے جانے کا خیال رحمان کے دل میں کچا پکا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ترائی میں نلائی کر چکنے کے بعد ہی وہ کہیں جائے گا۔ اور نیز کل کی مرغن غذا سے اس کے پیٹ میں پھر کوئی نقص واقع ہو گیا تھا۔ لیکن صبح جب اس نے پھر جوتوں کی حالت دیکھی تو اس نے سوچا اب انبالے جائے بنا چھٹکارا نہیں ہے۔ میں لاکھ انکار کروں لیکن میرا دانا پانی، میرے جوتے بڑے پروین ہیں۔ وہ مجھے سفر پہ جانے کے لئے مجبور کرتے ہیں۔ اس وقت صبح کے سات بجے تھے اور صبح کے وقت ارادے بلند ہو جاتے ہیں۔ رحمان نے پھر اپنا جوتا سیدھا کیا اور اپنے کپڑوں کی دیکھ بھال کرنے لگا۔

نیل سے دُھلے ہوئے کپڑے سوکھ کر رات ہی رات میں کیسے اُجلے ہو گئے تھے۔ نیلاہٹ نے اپنے آپ کو کھو کر سپیدی کو کتنا اُبھار دیا تھا۔ جب کبھی بڑھیا نیل کے بغیر کپڑے دھوتی تھی تو یوں دکھائی دیتا تھا جیسے ابھی انھیں جوہڑ کے پانی سے نکالا گیا ہو اور پانی کی مٹیالی رنگت ان میں یوں بس گئی ہو جیسے پاگل کے داغ میں واہمہ بس جاتا ہے۔

جینا کی ماں اوکھلی میں متواتر دو تین دن سے کُوٹ کر مُنڈل بنا رہی تھی۔ گھر میں عرصے سے پرانا گُڑ پڑا تھا جسے دھوپ میں رکھ کر کیڑے نکال دیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ سوکھی مکّی کے بھُٹے تھے۔ گویا جینا کی ماں بہت دنوں سے اس سفر کی تیاری کر رہی تھی اور جوتے کا جوتے پر چڑھنا تو محض اس کی تصدیق تھی۔ بڑھیا کا خیال تھا کہ ان مُنڈلوں میں سے رحمان کا زادِ راہ بھی ہو جائے گا اور بیٹی کے لئے سوغات بھی۔

رحمان کو کوئی خیال آیا۔ بولا...... ''جینا کی ماں، بھلا کیا نام رکھا ہے انھوں نے اپنے ننھے کا؟''

بڑھیا ہنستے ہوئے بولی...... ''ساہق (اسحاق) رکھا ہے نام، اور کیا رکھا ہے نام انھوں نے اپنے

ننھے کا۔ واہ سچ مچ کتنی کمزور ہے تیری یادداش۔"

اسحاق کا نام بھلا رحمان کیسے یاد رکھ سکتا تھا۔ جب وہ خود بھی ننھا تھا تو اس کا دادا بھی رحمان کا نام بھول گیا تھا۔ دادا کھاتا پیتا آدمی تھا۔ اس نے چاندی کی ایک تختی پر عربی لفظوں میں رحمان لکھوا کر اسے اپنے پوتے کے گلے میں ڈال دیا تھا۔ لیکن پڑھنا کسے آتا تھا۔ بس وہ تختی کو دیکھ کر ہنس دیا کرتا تھا۔ ان دنوں تو نام گاموں، شیرا، فتو، فجا وغیرہ ہی ہوتے تھے۔ اسحٰق، شعیب وغیرہ نام تو اب قصباتی لوگوں نے رکھنے شروع کر دیے تھے۔ رحمان سوچنے لگا...... ساحق اب تو ڈیڑھ برس کا ہو چکا ہوگا۔ اب اس کا سر بھی نہیں جھولتا ہوگا۔ وہ گردن اٹھا میری طرف ٹک ٹک دیکھتا جائے گا اور اپنے ننھے سے دل میں سوچے گا۔ اللہ جانے یہ بابا، چٹے بالوں والا بوڑھا ہمارے ہاں کہاں سے آ ٹپکا۔ وہ نہیں جانے گا کہ اس کا اپنا بابا ہے۔ اپنا نانا جس کے گوشت پوست سے وہ خود بھی بنا ہے۔ وہ چپکے سے اپنا منہ جینا کی گود میں چھپائے گا۔ میرا جی چاہے گا جینا کو بھی اپنی گود میں اٹھا لوں۔ لیکن جوان بیٹیوں کو کون گودی میں اٹھاتا ہے...... ناحق اتنی بڑی ہو گئی جینا۔ بچپن میں وہ جب کھیل کود کر باہر سے آتی تھی تو اسے سینے سے لگا لینے سے کتنی ٹھنڈ پڑ جاتی تھی۔ ان دنوں یہ دل پر سُلگتا ہوا اُپلا رکھا نہیں محسوس ہوتا تھا...... اب وہ صرف اُسے دور سے ہی دیکھ سکے گا۔ اس کا سر پیار سے چوم لے گا...... اور کیا وہی تسکین حاصل ہوگی؟

رحمان کو اس بات کا تو یقین تھا کہ وہ ان سب کو دیکھ کر بے اختیار رو دے گا۔ وہ آنسو تھامنے کی لاکھ کوشش کرے گا، لیکن وہ آپی آپ چلے آئیں گے۔ وہ اس لئے نہیں بہیں گے کہ تلنگا اس کی بیٹی کو پیٹتا ہے بلکہ زبان کے طویل قصوں کی بجائے آنکھوں سے اس بات کا اظہار کر دے گا کہ جینا، میری بیٹی ہے، تیرے پیچھے میں نے بہت کڑے دن دیکھے ہیں۔ جب چودھری خوش حال نے مجھے مارا تھا تو اس وقت میری کمر بالکل ٹوٹ گئی تھی۔ میں مر ہی تو چلا تھا۔ پھر تو کہاں دیکھتی اپنے ابا کو؟ لیکن دن آئی کوئی نہیں مرتا۔ شاید میں تمہارے یا ساحق یا کسی اور نیک بخت کے پانو کی خیرات بچ رہا......

"...... اور کیا ننھے کا لہو جوش مارنے سے رہ جائے گا؟ وہ ہمک کر چلا آئے گا میرے پاس اور میں کہوں گا۔ ساحق بیٹا، دیکھ میں تیرے لئے لایا ہوں تندل اور گڑ، اور کھلونے اور...... بہت کچھ لایا

ہوں، گانو کے لوگوں کا یہی گریبی دعوا ہوتا ہے۔ ننھا مشکل سے دانتوں میں پپول سکے گا کسی ہرے بھٹے کو اور جب تلنگے سے میری ٹُوٹُو میں میں ہوگی تو میں اسے خوب کھری کھری سناؤں گا۔ بڑا سمجھتا ہے اپنے آپ کو کل کے کلیری اور......اور......وہ ناراض ہو جائے گا کہے گا، گھر رکھو اپنی بیٹی کو......پھر میں اس کے بیٹے کو اٹھائے پھروں گا۔ گلی گلی، بازار بازار......اور من جائے گا تلنگا۔

رحمان نے تلائی کا بندوبست کیا۔ کھڑی کھیتی کی قسم پر کچھ روپے ادھار لئے۔ سوغات باندھی۔ زادِراہ بھی، اور یکے پر پانو رکھ دیا۔ بڑھیا نے اسے اللہ کے حوالے کرتے ہوئے کہا...... ''بصرہ چلا جائے گا، علیا چند روز میں۔ میری جینا کو ساتھ ہی لیتے آنا اور میرے ساتھے کو، کون جانے کب دم نکل جائے۔''

ملکہ رانی سے مانک پور پہنچتے پہنچتے رحمان نے اسحاق کے لئے بہت سی چیزیں خرید لیں۔ ایک چھوٹا سا شیشہ تھا۔ ایک سیلولائڈ کا جاپانی جھنجھنا جس میں نصف درجن کے قریب گھنگھرو ایک دم بج اُٹھتے تھے۔ مانک پور سے رحمان نے ایک چھوٹا سا گڈریا بھی خرید لیا تاکہ اسحاق اسے پکڑ کر چلنا سیکھ جائے۔ کبھی رحمان کہتا اللہ کرے، اسحاق کے دانت اس قابل ہوں کہ وہ بھٹے کھا سکے۔ پھر ایک دم اس کی خواہش ہوتی کہ وہ اتنا چھوٹا ہو کہ چلنا بھی نہ سیکھا ہو اور جینا کی پڑوسنیں جینا کو کہیں...... ''ننھے نے تو اپنے نانا کے گڈریے پر چلنا سیکھا ہے۔'' اور رحمان نہیں جانتا تھا کہ وہ ننھے کو بڑا دیکھنا چاہتا ہے یا بڑے کو ننھا۔ صرف اس کی خواہش تھی کہ اس کے تندل، اس کے بھٹے، اس کا شیشہ، اس کا جاپانی جھنجھنا اور باقی خریدی ہوئی چیزیں سب پھل ہوں۔ انھیں وہ مقبولیت حاصل ہو جس کا وہ متمنی ہے۔ کبھی وہ سوچتا کیا جینا گانو کے گنوار لوگوں کے ان تحائف کو پسند کرے گی؟ کیا ممکن وہ محض اس کا دل رکھنے کے لئے ان چیزوں کو پا کر باغ باغ ہو جائے لیکن کیا وہ صرف میرا جی رکھنے کے لئے ہی ایسا کرے گی؟ پھر تو مجھے بہت دکھ ہوگا۔ کیا میرے تندل سچ مچ اسے پسند نہیں آسکتے؟ میری بیٹی کو، میری اپنی جینا کو، علیا تو پرایا پیٹ ہے وہ تو کچھ بھی پسند نہیں کرنے کا۔ وہ تو نایک ہے۔ اللہ جانے، صاحب لوگوں کے ساتھ کیا کچھ کھاتا ہوگا۔ وہ کیوں پسند کرنے لگا گانو کے تندل۔ اور نانک پور سے روانہ ہوتے ہوئے رحمان کانپنے لگا۔

رحمان پر جسمانی اور ذہنی تھکاوٹ کی وجہ سے غنودگی سی طاری ہوگئی۔ رات کے گوشت نے اس کے پیٹ کا شیطان جگا دیا تھا۔ آنکھوں میں گدلاہٹ اور تیرگی تو تھی ہی، لیکن کچھ سفر، کچھ مرغن غذا کی وجہ سے آنکھوں میں سے شعلے لپکنے لگے۔ رحمان نے اپنے پیٹ کو دبایا۔ تلی والی جگہ پر ٹھس سی معلوم ہوتی تھی۔ جینا کی ماں نے ناحق گوشت پکایا۔ لیکن اس وقت تو اسے دوپٹے سے ہاتھ پونچھنا اور گوشت دونوں چیزیں پسند آئی تھیں۔

رحمان کو ایک جگہ پیشاب کی حاجت ہوئی اور اس نے دیکھا کہ اس کا قارورہ سیاہی مائل گدلا تھا۔ رحمان کو پھر وہم ہو گیا۔ بہر حال، اس نے سوچا، مجھے پرہیز کرنا چاہئے۔ پرانا مرض پھر عود کر آیا ہے۔

گاڑی میں کھڑکی کی طرف سے شمالی ہوا فراٹے بھرتی ہوئی اندر داخل ہو رہی تھی۔ درختوں کے نظر کے سامنے گھومنے، کبھی آنکھیں بند کرنے اور کھولنے سے رحمان کو گاڑی بالکل ایک نگورے کی طرح آگے پیچھے جاتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ دو تین اسٹیشن ایک اونگھ میں نکل گئے۔ جب وہ کرنال سے ایک دو اسٹیشن ورے ہی تھا تو اس کی آنکھ کھل گئی۔۔ اس کی سیٹ کے نیچے سے گٹھڑی اٹھالی گئی تھی۔ صرف اس کے اپنے گزارے کے لئے تندل اور چادر کے پلو میں بندھے ہوئے مکئی کے بھٹے، یا اس کے پھیلے ہوئے پانو میں گڈریا کھڑا تھا۔

رحمان شور مچانے لگا۔ اس ڈبے میں ایک دو اچھی وضع قطع کے آدمی اخبار پڑھ رہے تھے۔ بڈھے کو یوں سیخ پا ہوتا دیکھ کر چلائے۔ مت شور مچاؤ، اے بڈھے، مت غل کرو۔ لیکن رحمان بولتا چلا گیا۔ اس کے سامنے ایک بٹی ہوئی مونچھوں والا کانسٹبل بیٹھا تھا۔ رحمان نے اسے پکڑ لیا اور بولا تو نے ہی میری گٹھڑی اٹھوائی ہے، بیٹا...... کانسٹبل نے ایک جھٹکے سے رحمان کو پرے پھینک دیا۔ اس کھینچا تانی میں رحمان کا دم پھول گیا۔ بابو پھر بولے تو سو کیوں گیا تھا بابا؟ تو سنبھال کے رکھتا اپنی گٹھڑی کو تیری عقل چرنے گئی تھی؟

رحمان اس وقت ساری دنیا کے ساتھ لڑنے کو تیار تھا۔ اس نے کانسٹبل کی وردی پھاڑ ڈالی۔ کانسٹبل نے گڈریے کا لٹھا کھینچ کر رحمان کو مارا۔ اسی اثنا میں ٹکٹ چیکر داخل ہوا۔ اس نے بھی خوش

پوش لوگوں کی رائے کا پلّہ دیکھ کر رحمان کو گالیاں دینا شروع کیا اور رحمان کو حکم دیا کہ وہ کرنال پہنچ کر گاڑی سے اُتر جائے۔ اُسے ریلوے پولیس کے حوالے کیا جائے گا۔ چیکر کے ساتھ لڑائی میں ایک لات رحمان کے پیٹ میں لگی اور وہ فرش پر لیٹ گیا۔

کرنال آچکا تھا۔ رحمان، اس کی چادر اور گڈریا پلیٹ فارم پر اُتار دیے گئے۔ گڈریے کا لٹھ، جسم سے علاحدہ، خون میں بھیگا ہوا ایک طرف پڑا تھا اور مکّی کے بھٹے کھلی ہوئی چادر سے نکل کر فرش پر لڑھک رہے تھے۔

رحمان کے پیٹ میں بہت چوٹ لگی تھی اسے اسٹریچر پر ڈال کر کرنال کے ریلوے ہسپتال میں لے جایا گیا۔

جینا، ساہتا، علی محمد، جینا کی ماں...... ایک ایک کر کے رحمان کی نظروں کے سامنے سے گزرنے لگے۔ زندگی کی فلم کتنی چھوٹی ہے۔ اس میں بمشکل تین چار آدمی اور ایک دو عورتیں ہی آسکتی ہیں۔ باقی مرد عورتیں بھی آتی ہیں۔ لیکن ان میں سے کچھ بھی تو یاد نہیں رہتا۔ جینا، ساہتا، علی محمد اور جینا کی ماں...... یا کبھی کبھار ان ہی چند لوگوں کے لئے کش مکش کے واقعات ذہن میں تازہ ہو جاتے ہیں۔ مثلاً گڈریا پلیٹ فارم پر پڑا ہوا، اور مکّی کے لڑھکتے ہوئے بھٹے جنھیں خلاصیوں، واچ مینوں، سگنل والوں کے آوارہ چھوکرے اُٹھا اُٹھا کر بھاگ رہے ہوں اور ان کے کالے کالے چہروں میں سفید دانت بالکل اسی طرح دکھائی دیں جیسے اس تاریک سے پس منظر میں ان کی ہنسی، ان کے قہقہے...... یا دُور کوئی پولیس مین اپنی ڈائری میں چند ضروری وغیر ضروری تفاصیل لکھ رہا ہو۔

پھر لات ماری......

ایں؟ یہ نہیں ہوسکتا.......... اچھا، پھر لات ماری۔

اور پھر..........

پھر ہسپتال کے سفید بستر سے، کفن کی طرح منہ کھولے ہوئے چادریں، قبروں کی طرح چارپائیاں، عزرائیل نما نرسیں اور ڈاکٹر..........۔

رحمان نے دیکھا اس کی تندلوں والی چادر ہسپتال میں اس کے سرہانے پڑی تھی۔ یہ بھی وہیں

چھوڑ آئے ہوتے۔ رحمان نے کہا۔ ''اس کی مجھے کیا ضرورت ہے۔'' اس کے علاوہ رحمان کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ ڈاکٹر اور نرس اس کے سرہانے کھڑے ہر لحظہ لٹھے کی سفید چادر کو منھ کی جانب کھسکا دیتے تھے ...... رحمان کو قے کی حاجت محسوس ہوئی۔ نرس نے فوراً ایک چلمچی بیڈ کے نیچے سرکا دی۔ رحمان قے کرنے کے لئے جھکا اور اس نے دیکھا کہ اس نے اپنے جوتے بدستور جلدی سے چار پائی کے نیچے اُتار دیے تھے اور جوتے پر جوتا چڑھ گیا تھا۔ رحمان ایک میلی سی سکڑی ہوئی ہنسی ہنسا اور بولا ...... ''ڈاک دار جی! مجھے سفر پر جانا ہے، آپ دیکھتے ہیں میرا جوتا جوتے پر کیسے چڑھ رہا ہے؟''

ڈاکٹر جواباً مسکرا دیا اور بولا۔ ہاں بابا، تو نے بڑے لمبے سفر پہ جانا ہے، بابا.......... پھر رحمان کے سرہانے کی چادر ٹٹولتے ہوئے بولا۔ لیکن تیرا ازادِراہ کتنا نا کافی ہے.......... یہی فقط تندل اور اتنا لمبا سفر.......... بس جینا، جینا کی ماں، ساہقا اور علی محمد یا وہ افسوس ناک واقعہ..........

رحمان نے زادِ راہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور ایک بڑے لمبے سفر پہ وہ روانہ ہو گیا۔''

..........☆..........

رام لعل کے افسانے میں جوتا کا ذکر کئی بار آیا ہے۔ ایک افسانہ کا عنوان ہی ''چمار'' ہے۔ اس سے یہ اقتباس دیکھئے :

ڈیڑھ سال پہلے وہ ٹوٹے ہوئے جوتے کی وجہ سے بس کے فٹ بورڈ سے پھسل گیا تھا۔ کچھ چوٹ بھی لگی تھی، گھٹنے اور بازو کی کہنی چھل گئی تھی۔ اُس کی جیب میں زیادہ پیسے بھی نہیں تھے، صرف دو آنے، وہ ڈیوٹی سے فارغ ہو کر گھر جا رہا تھا۔ کسی موچی کی دُکان پوچھتے پوچھتے اس بڈھے کے پاس آ بیٹھا تھا جو پٹرول پمپ کے سامنے تنہا لکڑی کے اسٹال میں چمڑے کی بے شمار کترنوں، لکڑی کے سانچوں اور ادھ سلے نئے جوتوں کے درمیان تیز چمکتی ہوئی رانپی سے ایک چمڑے کا ٹکڑا کاٹ رہا تھا۔ سیاہ سڑا ہوا کمزور بدن جو کام کی لگن میں بالکل دہرا ہو جاتا تھا۔ وہ اصل میں بہت لمبا تھا۔

''اس جوتے کا تلہ اُکھڑ گیا ہے، چھ سات کیلیں جڑ دو ذرا جلدی سے!'' رام چندر نے جوتا پاؤں سے اُتار کر اُس کے قریب رکھ دیا اور اپنی جیب میں پڑے ہوئے دو آنے ٹٹولنے لگا۔

..........☆..........

بلراج کومل کے افسانے کا عنوان ''نئے جوتے'' ہے۔ اہمیت کے پیش نظر یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے :

اس نے منگت رام کے پورے وجود کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا اور جب اس کی نظریں اس کے جوتوں تک پہنچیں تو وہ ہنس کر بولا :

''تمہارے جوتے بڑے نازک اور نفیس ہیں مسٹر منگت رام۔''

''سر آپ تو مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ وہ تو میری نادانی تھی جو میں نے آپ کو جوتوں کا طعنہ دیا تھا۔ آئی ایم سوری سر۔''

''نہیں منگت رام اس میں شرمندہ ہونے کی کوئی بات نہیں۔''

''نہیں سر میں واقعی شرمندہ ہوں۔ آپ نے تو میرے ہر روز دیر سے دفتر پہنچنے پر مجھے صحیح طور پر ٹوکا تھا۔ یہ میری ہی غلطی تھی جو میں نے آپ کے جوتوں کو معمولی سمجھ کر یہ طعنہ دیا تھا کہ لڑائی کرنے کے لئے دونوں فریقوں کے جوتے ایک جیسے ہونے چاہئیں۔

''منگت رام پچھلی باتیں بھول جاؤ۔ آج اس دفتر میں میرا پہلا دن ہے۔ آج میں تمہیں ایک سرپرائز دینا چاہتا ہوں چونکہ تم اپنے معمول کے مطابق بالکل ٹھیک وقت پر دفتر میں آئے ہو۔''

یہ کہہ کر ادھیکاری نے ہرداس کو بھیج کر اپنے اسکوٹر کی ڈگی میں سے رنگین کاغذ میں پیک کئے ہوئے دو ڈبے منگوائے، پربھودیال کی موجودگی میں ہرداس کو انہیں کھولنے اور ان کے اندر کی چیزوں کو باہر نکال کر میز پر سجانے کا حکم دیا اور اطمینان سے انتظار کرنے لگا۔ ہرداس نے جب پیکنگ کا کاغذ اتار کر ڈبوں کے ڈھکنے اٹھائے تو وہ اور پربھودیال اور منگت رام یہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے کہ ان دونوں کے اندر ایک ہی ڈیزائن کے بڑے نفیس قسم کے جُوتے تھے۔

ادھیکاری نے آگے بڑھ کر منگت رام کا شانہ تھپتھپایا اور کہا :

''منگت رام یہ دونوں جوتے بظاہر ایک جیسے ہیں لیکن ایک کو پہن کر آدمی بھاگ بھاگ کر اپنی منزل تک پہنچتا ہے اور دوسرا وہ ہے جسے پہن کر آدمی پُر وقار، باعزت، بارعب ہو جاتا ہے کہ اس کے حکم کی تعمیل کو ٹالنا ناممکن ہے۔ انتخاب تم کرو گے .... جو تم اٹھاؤ گے وہ تمہارا ہوگا۔ جو رہ جائے گا وہ میرا۔ سائز کے بارے میں فکر نہ کرو۔ ہم دونوں کے پاؤں کی لمبائی ایک جیسی ہے، میں نے

اطمینان کرر کھا ہے۔اب آگے آؤ اور اپنی قسمت کا جوتا اٹھاؤ۔

☆

یٰسین احمد کے افسانہ ''جنت کا حق دار'' میں جہاں سسپنس ہے وہیں ماں کی عظمت کا اعتراف بھی ہے۔لیکن اس کا تعلق براہ راست جوتے سے ہے۔افسانہ کا اختتام اس طرح ہوتا ہے :

''میری بہن اس کو دیکھ کر چلائی ۔''بھیا اس کا لفافہ چھین لیجئے ۔اس میں ضرور جائیداد کے دستاویزات یا اماں کے زیورات ہونگے۔''

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔اس وقت میرا چھوٹا بھائی بھی کمرے میں آچکا تھا۔وہ لال بھبوکا ہورہا تھا اور ایک ہاتھ میں پستول پکڑرکھا تھا۔وہ غصہ سے چلایا۔'' کمینے سچ بتا کیا لینے آیا تھا ورنہ بھیجا اڑادونگا''

یوسف کچھ نہیں بولا۔اس کے ہاتھوں کی گرفت لفافہ نما بنڈل پر اور مضبوط ہوگئی تھی۔میرے بھائی نے پوری قوت سے ایک گھونسہ اس کے منہ پر رسید کردیا۔اس کے ہونٹ سے خون رسنے لگا۔ میرے بھائی نے دوسرے ہاتھ سے لفافہ جھپٹنا چاہا مگر یوسف کے ہاتھ سے لفافہ چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔فرش پر گرتے ہی عجلت میں تہہ کیا ہوا لفافہ خود بخود کھل گیا۔

یکا یک ایک زلزلہ سا آگیا اور ہمارے پیروں کے نیچے سے زمین شق ہوگئی اور ہم سب اس شق شدہ زمین کی گہرائیوں میں اترتے چلے گئے۔کم ازکم میں نے تو ایسا ہی محسوس کیا تھا،یوسف نے جیتے جی جنت کا راستہ پالیا تھا۔

کھلے ہوئے لفافہ نما بنڈل میں زیوات نہیں تھے۔دستاویزات نہیں تھے۔چپل کا ایک جوڑا تھا۔ اماں کی استعمال شدہ چپل......!!

☆

جوتے پر ایک افسانہ ظہیر خان کا ''اور جوتا چل گیا'' ہے انہوں نے الیکشن کو موضوع بنا کر اس کا اختتام اس طرح کیا ہے :

آج الیکشن کا دن ہے۔کریم بھائی کے چہرے سے صاف ظاہر ہے کہ پچھلی شب،شب ہجراں

کی طرح جاگ کر گزاری ہے۔ کریم بھائی نے آج صبح کی نماز باجماعت ادا کی ہے۔ ویسے کریم بھائی نماز کے پابند تو ہیں مگر صرف عید اور بقرعید کی۔

پولنگ اسٹیشن پر بڑی گہما گہمی ہے۔ ہر اُمیدوار کے کارندے اپنے اپنے اوٹروں کو گاڑیوں میں بٹھائے پولنگ اسٹیشن لا رہے ہیں۔ ایسے میں کریم بھائی اپنے ان کرم فرماؤں کو تلاش کر رہے ہیں جنہوں نے کریم بھائی کو سہانے خواب دکھائے مگر آج ان کا کہیں پتا نہیں ہے۔

شام ہونے کو آئی۔ ابھی پولنگ ختم ہونے کو ایک گھنٹہ باقی ہے۔ اچانک ایک شور سنائی دیا۔ ہر کوئی اسی طرف بھاگا جدھر سے شور کی آواز آ رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ دو پارٹیوں کے دفتر جو آمنے سامنے ہیں، ایک ''معصوم پارٹی'' دوسری ''مسکین پارٹی''۔ ان کے کارکنوں میں پہلے تُو تُو میں میں ہوئی۔ پھر خوبصورت گالیوں کا تبادلہ ہوا، بعدازاں جوتا باری شروع ہو گئی اور اس طرح الیکشن والے دن...... جوتا چل گیا۔

''مگر کریم بھائی کا کیا ہوا؟

وہی ہوا جو ہونا تھا۔ یعنی ضمانت ضبط ہو گئی۔ اپنی جوتوں کی دکان فروخت ہو گئی۔ بیوی نے میکے کی راہ لی۔ اب کریم بھائی ہیں کہ بیٹھے ہوئے ہیں......

''تصورِ جوتا کیے ہوئے''

☆

سعادت حسن منٹو نے جہاں جلتے سلگتے مسائل پر افسانے لکھے ہیں وہیں ''جوتا'' کے عنوان سے افسانچہ بھی لکھا ہے:

ہجوم نے رخ بدلا اور سر گنگا رام کے بُت پر پل پڑا۔ لاٹھیاں برسائی گئیں۔ اینٹیں اور پتھر پھینکے گئے۔ ایک نے منہ پر تار کول مل دیا۔ دوسرے نے بہت سے پرانے جوتے جمع کیے اور ان کا ہار بنا کر بت کے گلے میں ڈالنے کے لئے آگے بڑھا۔ مگر پولیس آ گئی اور گولیاں چلنا شروع ہوئیں۔ جوتوں کا ہار پہنانے والا زخمی ہو گیا۔ چنانچہ مرہم پٹی کے لئے اسے سر گنگا رام ہسپتال بھیج دیا گیا۔

☆

منظور الامین نے تحقیق سے کام لے کر جوتا کے جہانِ تازہ کو صیقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی تاریخی روایات میں امتیازی نشان اور پہچان ہیں۔ ذکر کی خوبیوں کی طرفیں کھلتی ہیں اور معنویاتی ندرت سامنے آتی ہے۔ تحقیق کی چند مثال دیکھئے :

بچپن میں ہم نے جوناتھن سوئفٹ کی کتاب Gullivers Travels پڑھی تھی، ایک تصویر میں گلیور کو ایک بڑے سائز کا انسان بتایا گیا تھا جو للی پٹ نامی ملک کی زمین پر چت پڑا ہوتا تھا۔ اس کے پاؤں کے جوتے بہت بڑے دکھائے گئے تھے جن کو اس ملک کے چھوٹے چھوٹے قد کے باشندے منی منی ڈوریوں سے باندھ رہے تھے ساتھ ہی اس کے جسم کو بھی، اس تصویر کو ہم اکثر دیکھا کرتے تھے۔ اس وقت ہمارے چھوٹے سے دماغ میں یہ بات پیوست ہو گئی تھی کہ گلیور ایک بڑا سا جن تھا جس کے پاؤں بھی بڑے تھے جن کو پہننے کے لئے میگا سائز کے شو درکار تھے۔

اس کتاب کو پڑھنے کے کچھ دن بعد ہی ہم نے بازار میں جوتوں کی ایک دکان کے اوپر لٹکا ہوا ایک بڑے سائز کا جوتا دیکھا اس وقت ہمیں وہ دکان، دکان کم نظر آئی تھی اور جوتا زیادہ۔ کیونکہ وہ جوتا اس دکان کے جغرافیے پر پوری طرح حاوی تھا۔ ہم نے اس جوتے کے ساتھ ہی ایک نوٹس بھی لگی دیکھی تھی جس پر لکھا تھا۔

مفت مفت مفت

یہ جوتا مفت دیا جائے گا اسے جسے یہ فٹ آجائے۔

ہمیں یاد ہے اس جوتے کو دیکھ کر ہم مچل گئے تھے۔ دو ایک منٹ اسے غور سے دیکھتے رہے تھے پھر اپنے پاؤں پر نظر ڈال کر یہ اندازہ لگایا تھا کہ وہ جوتا ہمیں فٹ ہونے والوں میں نہیں تھا۔ پھر خیال کہ جوتا گلیور کو ضرور فٹ بیٹھے گا۔ جس ملک کے لوگ واقعی بہت بڑے قد آور سائز کے تھے اور جہاں جانے پر خود گلیور کی ہستی Lilliputian ہو کر رہ گئی تھی۔

..................☆..................

جوتے کے سائز سے متعلق ایک تحقیق اس طرح ہے :

یہ واقعہ فرانس کے بادشاہ فلپ کے دور حکومت کا ہے جب ایک شاہی فرمان میں کہا گیا تھا کہ

کوئی درباری چار سے زیادہ ملبوس نہ پہنے۔ اس امتناع میں جوتے کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ اس ''حکم نامے'' کے پیش نظر امراء اور رؤسا نے اپنے اپنے ملبوسی ترجیحات طے کیے۔ امراء نے دو دو فٹ لمے جوتے پہننے شروع کر دئے اور یہ فیشن بن گیا۔ Nicopolis کی جنگ میں جب فرانسیسیوں کو ہزیمت ہوئی تو امراء کو جنگ کا میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑا اور انھیں بالآخر جوتوں کے سائز کو چھوٹا کرنا پڑا۔

☆

چین میں لڑکیوں کو لوہے کے جوتے پہنائے جاتے تھے تاکہ پاؤں چھوٹے رہیں۔ وہاں چھوٹے پاؤں خوبصورتی کی علامت سمجھے جاتے تھے۔ منظور الامین تفصیل بتاتے ہیں :

چین میں ہوا یہ کرتا تھا کہ دو سے سات سال کی عمر کے درمیان لڑکیوں کی Foot Binding کی جاتی تھی۔ پاؤں کی چار انگلیوں کو جھکا دیا جاتا تھا۔ صرف پاؤں کے انگوٹھے کو سیدھا رکھا جاتا تھا اور پھر ان کو عورتوں کے ہاتھ کے بنے ہوئے جوتے پہنا دئے جاتے تھے۔ یہ اس لئے کہ چھوٹے چھوٹے پاؤں خوب صورتی کی نشانی مانے جاتے تھے۔

مردوں کا خیال تھا کہ چھوٹی بچیاں بلوغت کو پہنچنے پر Sexually زیادہ قابل قبول بن جاتی تھیں۔ عورتوں کے پاؤں چھوٹے ہو جانے کی صورت میں چھوٹے چھوٹے پاؤں انھیں زیادہ خوب صورت لگتے تھے۔

یہ پریکٹس چینی انقلابی لیڈر Sunyatsen نے ۱۹۱۱ء میں ختم کروادی۔

☆

جوتا کے سلسلے میں ایک پہیلی بھی مشہور ہے :

لکڑی کی ٹانگ لوہے کا، جوتا کاٹ کے رکھ دے ایسا چھوتا

☆

ہمارے یہاں مشرق میں جوتیوں میں دال بٹتی ہے۔ لیکن مغرب میں لوگ جوتیوں میں شراب ڈال کر پیتے ہیں۔ دراصل مغرب کے مرد اپنی مخالف جنس کے نہ صرف پرستار ہی ہوتے ہیں بلکہ

دیوانے بھی۔ اور دیوانے بھی اس حد تک کہ یہ Gallant نوجوان اپنی گلفام Lady Love کی حسین و نازک جوتیوں تک میں شراب ڈال کر پیتے ہیں۔ صرف خوبصورت Crystals ہی میں مے نہیں لنڈھائی جاتی۔

اردو کا شاعر جل بھن کر اس طرح کا شعر کہتا ہے :

کیا رذیلاں کا جینا جینا ہے
تیری جوتیاں میں پانی پیتا ہے

☆

جوتے کا ٹوٹکا بھی مشہور ہے۔ ہمارے یہاں تو ہم پرستی زیادہ ہے اس لئے پرانے جوتے کار کے پیچھے باندھ دیئے جاتے ہیں۔ اس کار کے پیچھے جس کے اندر نئے دولہا دلہن نئی زندگی شروع کرنے جاتے ہوئے سوار ہوتے ہیں۔ ان پرانے جوتوں کا ٹوٹکا ہوتا ہے کہ خدا کرے آنے والی زندگی میں دولہا دلہن کی آپس میں جوتم پیزار نہ ہو۔ کہیں جوتوں کو ٹرک کے پیچھے لٹکا دیا جاتا ہے۔ ٹرک ہی پر یہ لکھ کر "بری نظر والے تیرا منہ کالا"۔ جوتوں کا ایک ٹوٹکا یہ بھی ہے کہ مرگی کے مریض کو جوتا سنگھایا جاتا ہے۔

بعض جگہ یہ ٹوٹکا ہے کہ دولھے کے کپڑوں کے ساتھ غسل کے لوازمے میں کھڑاؤں بھیجے جاتے ہیں جن پر چاندی کا پتر چڑھا ہوتا ہے۔

ٹوٹکا کے ذریعہ عرصہ پہلے عورتوں کے دل جیتنے کے طریقے بھی دلچسپ ہوا کرتے تھے۔ نعل کے معنی ہے جوتا، فارسی کا ایک محاورہ ہے نعل در آتش۔ اس کے مطابق طریقہ کار یہ تھا کہ اگر کسی شخص کا کسی کو اپنی محبت میں بے قرار کرنا منظور ہوتا تو وہ گھوڑے کی نعل پر محبوب کا نام لکھ کر آگ میں ڈال دیتا اور کچھ افسوں وغیرہ پڑھتا، بس خاتون محبت میں بے قرار ہو کر اپنے طالب کے پاس چلی آتیں اور اس کی مطیع ہو جاتیں۔

☆

مولانا عبدالماجد دریابادی صحافی بھی تھے۔ انہوں نے کسی مندر سے سونے کے گہنے چوری ہو

جانے کے بارے میں لکھا تھا کہ بیچارہ مسلمان مسجد میں چوری کرنے جاتا ہے تو اسے صرف پرانے جوتے ملتے ہیں۔ بقول علامہ اقبال ؀

مسجد میں دھرا کیا ہے بجز موعظ و پند

شاید اسی لئے شاعروں نے شرطیں لگانی شروع کردی ہیں :

شاعر اب اس شرط پر بزم سخن میں آئے گا
ان کا جوتا ختم محفل پر اسے مل جائے گا
کوئی اس جوتے کا سرقہ تو نہیں فرمائے گا

....

وہ غزل ایسی پڑھے گا جو کبھی سوچی نہ ہو
شرط یہ ہوگی کہ محفل میں کوئی موچی نہ ہو

..................☆..................

جوتے سے ڈاکیے کا گہرا تعلق ہے۔ آپ نے بچپن میں انگریزی کی وہ نظم پڑھی ہوگی :

Hurrah for the post man
who brings us the news
What a lot must cost
to pay for his shoes

ہمارے یہاں ڈاکیے کے جوتے بہت جلد گھس جاتے ہیں۔ انھیں ڈور ٹو ڈور اتنا پیدل چلنا پڑتا ہے کہ جوتے ہانپتے ہی رہتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان کے لئے لکڑی کے جوتے بنائے جائیں!

اردو ادب میں جوتے کے ہزار رنگ ہیں جو نفی اور اثبات کی نگارش سے ہمکتے اور لہکتے ہیں !

..................☆..................

کتابیات

(اخبار و رسائل)

- ادبی محاذ = کٹک
- اسباق = پونہ
- اضام = وشاکھا پٹنم
- اعتماد = حیدرآباد
- انتساب = سرونج
- انشاء = کولکاتا
- اوراق = لاہور
- بیباک = مالیگاؤں
- پرواز = لندن
- پندار = پٹنہ
- ترسیل = ممبئی
- جام نور = دہلی
- جنگ = کراچی
- چہار سو = راولپنڈی
- خوشبو کا سفر = حیدرآباد
- خیر اندیش = مالیگاؤں
- راشٹریہ سہارا = پٹنہ
- رنگ = سجوا
- رنگ و بو = حیدرآباد
- رہنمائے دکن = حیدرآباد
- زاویہ = سویڈن
- شاعر = ممبئی
- شاندار = اعظم گڈھ
- شگوفہ = حیدرآباد
- شوخیاں = رانچی
- صدائے اردو = بھوپال
- ظرافت = بنگلور
- عالمی رنگ ادب = کراچی
- عالمی سہارا = نوئیڈا
- ”خدسہ“ = حیدرآباد
- عفت = راولپنڈی
- فاروقی تنظیم = پٹنہ
- فنکار = گوالیار
- قومی تنظیم = پٹنہ

- کوہسار جرنل = بھاگلپور
- گلبن = لکھنؤ
- گل بوٹے = ممبئی

گلشن اطفال = مالیگاؤں

- گواہ = حیدرآباد
- گوشوارہ = رڑکی
- گونج = نظام آباد
- لاریب = لکھنؤ
- مباحثہ = پٹنہ
- مسرت = دہلی
- معاصر = لاہور
- ملی اتحاد = دہلی
- میرٹھ میلہ = میرٹھ
- ندائے حرم = حیدرآباد
- نوائے وقت = اسلام آباد
- نونہال = کراچی
- نیو ایج وژن = دہلی
- وسیلہ = کڑپہ

کتب

- گرہن = راجندر سنگھ بیدی
- سیاہ حاشیے = سعادت حسن منٹو
- گلی گلی = رام لعل

2018ء میں پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی نئی کتابیں

- تنقیدی اساس (تنقید) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 250/-
- فہم و تفہیم (تنقید) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 200/-
- تنقیدی شعور (تنقید) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 250/-
- عبدالمنان طرزی کی طرز بیانی (تنقید) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 150/-
- جاسوسی ناول نگار عارف مارہروی سے انٹرویو (انٹرویو)
  ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 80/-
- सवालों के घेरे में कथाकार रंजन (انٹرویو) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 150/-
- The Faith of Morn ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 100/-
  (ریگا کا ترجمہ: محمد حسنین)
- سرگزشتِ اسیر (منٹو کا ترجمہ) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 150/-
- شبنمی لمس کے بعد (ناول) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 250/-
- پروفیسر محمد حسن بنام پروفیسر عبدالواسع (خطوط) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 80/-
- ساحر شیوی کا نیا شناخت نامہ (تنقید) موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی 150/-
- خدنگ جستہ (ناول) بک امپوریم، پٹنہ 100/-
- امام اعظم کی بازآفرینی (تنقید) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 150/-
- رعنا (نئی صنف سخن کا انتخاب) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 100/-

عبدالمنان طرزی کی طرز بیانی
پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

پروفیسر محمد حسن
بنام
پروفیسر عبدالواسع
پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

مظہر امام کا اکلوتا افسانہ: تجزیہ

URDU ADAB MEIN JOOTE

by

Prof. Manazir Ashiq Harganvi

مناظر عاشق ہرگانوی کی خدمات کے اعتراف میں کتابیں

● مناظر عاشق ہرگانوی: ناقد اور شاعر (نظام صدیقی) ● مناظر نامہ (منظوم) (پروفیسر عبدالمنان طرزی) ● ہرگانوی: ناقد اور محقق (ڈاکٹر شمس تبریز خان) ● ہرگانوی: بحیثیت شاعر (ڈاکٹر نیر حسن نیر) ● ہرگانوی: ہشت جہاتی فنکار (ڈاکٹر نوشاد عالم آزاد) ● ہرگانوی: بچوں کے ادیب (ڈاکٹر سید جمشید حسن) ● ہرگانوی: شخصیت (پروفیسر فردوس خاں روحی) ● ہرگانوی کا ادبی منظر نامہ (ڈاکٹر نذیر فتح پوری) ● ہرگانوی کی ژرف گوئی (ڈاکٹر نذیر فتح پوری) ● ہرگانوی: کثیر الجہت فنکار (ڈاکٹر محفوظ الحسن) ● مناظر جناب (منظوم) (افروز عالم) ● مناظر صاحب کتابیں بلیں (ڈاکٹر نذیر فتح پوری) ● ہرگانوی کی شاعرانہ جہتیں (ڈاکٹر مظفر مہدی) ● ہرگانوی کا شعری زون (ڈاکٹر امام اعظم) ● ہرگانوی ۹۹ تخلیق میں (منزل لوہا شیری) ● ہرگانوی کی ہر سانس محمد پڑھتی ہے (ڈاکٹر نذیر فتح پوری) ● ہرگانوی سے انٹرویوز (ترنم جمال) ● ہرگانوی کے آٹو گراف بک پر ناقدانہ نظر (ڈاکٹر نذیر فتح پوری) ● ہرگانوی کی آنکھوں دیکھی: تجزیہ (احمد معراج) ●मनाजिर आशिक हरगानवी :सर्जक एवं समालोचक (یوگل کشور پرساد) ● ہرگانوی کی افسانچہ دوستی (ڈاکٹر نذیر فتح پوری) ● ہرگانوی: شاعروں کی دوربین نگاہ میں (محمد افضل خاں) ● ہرگانوی کی تنقیدی شناخت (ڈاکٹر شبانہ خاتون) ● ہرگانوی کی ادبی آبیاری (صفی الرحمٰن راعین) ● ہرگانوی کی افسانوی جہتیں (عذرا مناظر) ●हरगानवी की सरापा सौंदर्य गज़ले : दृष्टि–परि दृष्टि (یوگل کشور پرساد) ● ہرگانوی کے افسانے اور تجزیے (ڈاکٹر عرشِ منیر) ● ہرگانوی کی نعت گوئی میں ندرت فن (ڈاکٹر زہرہ شمائل) ● ہرگانوی: توشیحی نظم (عبدالمنان طرزی) ● ہرگانوی بنام نذیر فتح پوری (ڈاکٹر نذیر فتح پوری) ● ہرگانوی کی ادبی فن کاری (صفی الرحمٰن راعین) ● ہرگانوی: فکر و نظر کی چند جہتیں (ڈاکٹر احسان عالم) ● ہرگانوی: ایک نابغہ (ڈاکٹر منصور خوشتر) ● ہرگانوی: طنز و مزاح کے دائرے میں (محمد پرویز) ● ہرگانوی: ادب کا کولمبس (ڈاکٹر نذیر فتح پوری) ● ہرگانوی اور ڈاک ٹکٹ کی اعزاز یابی (صفی الرحمٰن راعین) ● ہرگانوی: خواتین قلم کار کی نظر میں (بی الہام فاطمہ) ● ہرگانوی کی تخلیقی بصیرت (ڈاکٹر عشرت بیتاب) ●●

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
New Delhi INDIA

ISBN 978-93-88736-35-0

www.ephbooks.com